ٹپکتے ہنستے سپنے

لیلیٰ لکھنوی

بارِ اوّل ایک ہزار

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

الہ آباد

پبلشنگ ہاؤس

سلیمی پریس الہ آباد میں طبع ہوئی

ان تاروں کے نام

جن کو میں چھو نہ سکی

اس منزل کے نام

جس تک میں پہنچ نہ سکی

لیلیٰ

فہرست

شفیقہ بیگم — پیش لفظ

۱ تارے ہنستے رہے — ۱

۲ جوش — ۱۳

۳ آگ جلتی رہی — ۱۹

۴ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے — ۲۹

۵ سراب — ۳۹

۶ وہ پھول — ۴۷

۷ گناہوں کے سائے میں — ۵۵

۸	عشق پر زور نہیں	۶۵
۹	نیند	۷۵
۱۰	پہلی ٹھوکر	۸۳
۱۱	کلی	۹۲
۱۲	یا اللہ بارش نہ ہو	۹۹
۱۳	ایک ہی غلطی	۱۰۵
۱۴	بہت دن گذرے	۱۱۱
۱۵	جھنکار	۱۱۹
۱۶	تم	۱۲۵
۱۷	رم جھم	۱۴۲
۱۸	ٹوٹے تار	۱۴۹
۱۹	جہلم کے کنارے	۱۵۷
۲۰	جب ساز ٹوٹ گئے	۱۶۵
۲۱	ہرجائی	۱۷۵

پیش لفظ

جیسے ہی سونے کا وقت آیا اور بچے دادی اماں کے لحاف میں گھس گئے "دادی اماں کہانی سناؤ" "دادی اماں کہانی سناؤ" کی جو رٹ لگی ہے تو بس ایسی کہ ان کو کہانیاں سنائے ہی بن پڑی، اور یہ بات بھی روز کی ہے، دادی اماں اچھی طرح جانتی ہیں کہ یہ بچے بغیر کہانی سنے پیچھا نہیں چھوڑتے، اور پھر جب دادی اماں نے اپنی کہانی شروع کر دی تو ختم ہوتے ہوتے آدھے بچے خراٹے لینے لگے اور ایک دو جنھیں بچاری شہزادی پر ذرا بھی رحم آیا وہ انجام کے لئے آنکھیں ملنے لگے اور دادی اماں کی کہانی ذرا سی دیر میں ختم ہوگئی، بادشاہ کی مراد پوری ہوئی اور اوپر والا ہماری سب کی مرادیں اسی طرح پوری کرے۔ پھر کسی نہ کسی طرح بچوں کو ان کے بستر پر ڈھکیل دیا گیا۔

چونکہ کوڑی دور کی ہے اس لئے سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے، یہ کہانی سننے کا شوق بھی کچھ ایسا نرالا ہے کہ بچپن سے ہماری فطرت میں رس بس گیا ہے اور

اسی کے ساتھ ساتھ کہانی سنانے کا شوق کچھ یوں ہی دادی اماں کا ایک جزو بن گیا ہے، دادی اماں ہوں، یا مغلانی بی۔ انھیں وہ روایاتی کہانیاں بچوں کو سنانی ہی پڑیں گی ورنہ پھر انھیں نیند کس طرح آئے گی ——— وہی اوپر والی کہانی "ایک تھا بادشاہ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔

اور ہم سب سننے والے اسی بادشاہ کے اونچے محل، اس کی حرم سرا کی عظمت کے بارے میں سوچنے لگ جاتے اور دادی اماں کی کہانی آگے بڑھ جاتی اور پھر جب ہم سنبھلتے تو معلوم ہوتا کہ یوں تو اس بادشاہ کے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا مگر "بس ایک اس کو اولاد ہی کا غم تھا" تو پھر ہم چونک پڑتے اور کہانی سننے کا شوق پھر بڑھ جاتا کہ دیکھیں اس کے لئے اس نے کیا کیا جتن کئے۔ اور اسی وارث تخت و تاج کی تلاش میں تو کہانی کا انحصار ہے یہ کہانی جو روز نئے انداز میں پیش ہوتی ہے اور ہر بار سننے والے کو ایک نیا مواد ملتا ہے۔

آج کل بھی کہانی سننے والوں کی کمی نہیں اور کہنے والے اپنی کہے جاتے ہیں وہ عصمت چغتائی ہوں، کرشن چندر ہوں، یا ایم اسلم، آسی رام نگری ہوں اور لیلےٰ لکھنوی افسانے لکھتے رہتے ہیں اور پڑھنے والے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کی کہانیاں پڑھتے ہیں اور اپنے مذاق کو بقدر ظرف تسلی دیتے ہیں۔

"تارے ہنستے رہے" لیلیٰ لکھنوی کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جسے الہ آباد پبلشنگ ہاؤس نے انتہائی خوبصورتی سے چھاپا ہے۔ لیلیٰ لکھنوی کا نام اردو پڑھنے والوں

کے لئے نیا نہیں ہے۔ وہ عرصہ سے کہانیاں لکھتی ہیں۔ اور ایک بڑا حلقہ ہے جو ان کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔

دادی اماں اگر بادشاہوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں تو لیلیٰ لکھنوی اُن صاحبانِ ثروت لوگوں کے زندگی کے کارنامے بیان کرتی ہے جن کی زندگی میں ان بادشاہوں کی سی عظمت ہے یہ اور بات ہے کہ ان کی کہانیاں ختم کرنے کے بعد آپ دادی اماں کی طرح یہ نہ کہہ سکیں گے "جس طرح ان کی مرادیں پوری ہوئیں اوراوپر والا ہماری مرادیں بھی پوری کرے"

"تارے ہنستے رہے" ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں دنیا کے ہنگامے ہیں ایسے ہنگامے جن میں زندگی رقص کناں نظر آتی ہے، وہ ایک رقص میں مصروف ہے جس میں پائل کی جھنکار نہیں، اداؤں کی سرمستی نہیں اور نگاہوں کے کیفیات بھی معدوم ہیں، وہ ایسا رقص ہے جو بھنور کے دائرے کی گہرائی میں ڈوبا جا رہا ہو اور آسمان کے تارے ہیں کہ جھلملائے جا رہے ہیں، ہنستے جا رہے ہیں، لیلیٰ لکھنوی خود ایک سیارے کی طرح آسمان سے ان مناظر کو غیر جانبدارانہ طور پہ دیکھ رہی ہے، وہ سب کچھ کہہ دینے کے بعد بھی کچھ نہیں کہتی، وہ اونچے طبقے کے کرداروں کو دیکھتی ہے وہ جو بھوک میں گھومتے ہیں جن کی زندگی طبقاتی کشمکش نہیں ... کے یہاں بھوک اور بیکاری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، وہ جو اپنی سماجی زندگی میں ... کھیلتے ہیں اور عشق کرتے ہیں ... پھر ... عشق کی ناکامیابی پہ آنسو بہانے کے بجائے نئے رومان کی تلاش پہ نکل کھڑے

ہوتے ہیں یا پھر خودکشی کرتے ہیں۔

لیلےٰ لکھنوی زندگی کے اقتصادی مسائل نہیں پیش کرتیں، دنیا دو صفوں میں بٹ گئی ہے یا نہیں، امریکہ تیسری ایٹمی جنگ کرانے میں کامیاب ہو جائیگا یا آج امن پسند اشتراکی قوتوں کی فتح ہوگی لیلےٰ لکھنوی ان مسائل میں نہیں الجھتیں، وہ طبقاتی جنگ کا نظارہ نہیں کرتیں، اشتراکیت کے خواب نہیں دیکھتیں، اس لئے کہ یہ ان کے افسانوں کی جولانگاہ نہیں ہے۔

لیلےٰ لکھنوی شعوری طور پر جنسیاتی افسانے بھی نہیں لکھتیں جس سے مزاج کو جنسی تلذذ حاصل ہو۔ بلکہ وہ ہلکے پھلکے رومانوی افسانے لکھتی ہیں جس میں جنسیات کا تناسب بھی ہے اور موجودہ سماجی زندگی کی بیچارگی بھی اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے جس میں غیر جانبداری ہے اور اپنی ہم جنس سے جانبداری کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔

"نیند" پڑھئے، مختصر ترین افسانہ ہے، ایک مکالمہ ہے جس میں دو کردار ہیں شوہر اور بیوی ——— مگر مصنفہ بڑی خوبصورتی سے اپنی شخصیت کو الگ رکھتی ہے۔ اور قلم ہر بار بچ کر نکل جاتا ہے، عورت کی بیچارگی پر وہ رنج و غم کا اظہار بھی نہیں کرتی، بلکہ اس تمام واقعہ کو دو تین صفحہ میں بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیتی ہے، اور پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کاش یہ افسانہ اور طویل ہوتا ڈھکی چھپی باتیں کچھ سامنے تو آئیں۔ مگر مصنفہ نے اس چنگاری میں وہ راکھ بکھیری ہے کہ اگر چنگاری بجھی نہیں تو کیا ڈھک تو گئی، پڑے سلگنے دو، اللہ ماری یوں ہی آپ ہی آپ بجھ جائے گی اور نہ بجھی بھی تو کیا لے گی، راکھ کا ڈھیر تو پڑا ہے۔

یہی وجہ ہے ایک بہت بڑا حلقہ لیلیٰ لکھنوی کے افسانوں کو پڑھتا ہے اور سر دھنتا ہے وہ ہر ماہ اُس پرچے کا انتظار کرتا ہے جس میں موصوفہ کی کہانیاں چھپتی ہیں، اور ان کی کہانیاں ہزار دو ہزار چھپنے والے پرچوں ہی میں نہیں بلکہ بیس اور پچیس ہزار چھپنے والے پرچوں میں چھپتی ہیں اور ہزاروں آدمی اس کو شوق سے پڑھتے ہیں اور یہ امر دوسروں کے لئے قابلِ رشک ہے اور اُن کے لئے لایق تحسین بھی۔

مجھے اس مجموعہ کے بارے میں زیادہ تفصیل سے کچھ نہیں لکھنا ہے۔ اس لئے کہ ان کو پرکھنے کا فریضہ تو تبصرہ نگاروں پر ہے۔

کڑیاں (موصوفہ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ) کے افسانوں کا دیباچہ لکھتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے کہ "اگر موصوفہ لکھتی رہیں تو آگے چل کر ایک اچھی افسانہ نگار بن جائیں گی"

میں سمجھتی ہوں کہ اُردو کے ایک مستند نقاد کی اس رائے کا اقتباس پیش کرنے کے بعد اب ضرورت بھی نہیں رہتی کہ اور کچھ لکھا جائے، اس لئے کہ لیلےٰ لکھنوی کا قلم رکا نہیں، اس میں جمود نہیں پیدا ہوا وہ برابر لکھ رہی ہیں اور ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔ "تارے ہنستے رہے" میں ان کے تازہ افسانے شامل ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ بھی اسی شوق سے پڑھا جائے گا جیسے ان

و

کے افسانے اُردو داں طبقے میں پڑھے جاتے ہیں۔

صدیقہ بیگم (سیوہاروی)

۱۶ بیوا گھاٹ روڈ، الہ آباد

تار منشی ر

باہر سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور مینٹل پیس پر رکھے ہوئے گلابی واز میں سے ڈیلیا کی پتیاں گر کر فرش پر بکھر گئیں ـــــ سرخ، زرد، گلابی، صوفے پہ لیٹے لیٹے زہرا نے دیکھا ـــــ واز میں اب صرف ڈنڈیاں رہ گئی تھیں ـــــ اور ایک دو کلیاں جو شام تک کھل جائیں۔

کس قدر پھولوں سے محبت تھی اس کو ـــــ گھنٹوں اکیلی بیٹھی وہ ہر واز میں پھولوں کو بڑے آرٹسٹک اسٹائل سے لگایا کرتی تھی، اور پھر یہ پھول اس کے باغ کے ہوتے تھے۔ ہر صبح گلابی ربن سے لپٹے ہوئے پھول وہ اس کو بھیجا کرتا تھا، سرخ، سیاہی مائل ڈیلیا، سویٹ، پینیر، پیزی، کارنیشن، کری آپسیز، اور وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنے کمرے میں ان کو سجاتی تھی، وہ آہستہ سے اٹھی اور ڈیلیا کی بکھری ہوئی پتیوں کو چننے لگی۔

"زہرا" دوسرے کمرے سے اس کے شوہر نے اس کو پکارا۔

"کہئے" اس نے وہیں سے پوچھا

"تمھارا فون آیا ہے"

"ابھی آئی" وہ تیزی سے دوڑی

"ہلو"

"میں عشرت بول رہا ہوں"

"او عشرت" وہ مسکرا دی

"کیا کر رہی ہو"

"پتیاں چن رہی تھی، آپ کے بھیجے ہوئے پھول ہوا سے ٹوٹ کر بکھر گئے۔

"ابھی اور بھجوا دوں گا"

"آپ کتنے اچھے ہیں"

"اور تم بھی تو"

"معلوم نہیں"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں"

"آپ بڑے وہ ہیں"

"زہرا"

"جی"

"آج تم نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہیں"

"سیاہ اور گلابی"

"بڑا خوبصورت کنٹراس ہے"

"زہرا"

"ہوں"

"آج پھر چاند نکلے گا"
"ہاں"
"کیا تم یہاں آسکو گی"؟
"کیسے بتلاؤں"
"کیوں؟
"اسلم سے بھی تو پوچھنا ہے"
"کوشش کرو"
"ضرور"
"خدا حافظ"
"جیسے ہی وہ فون کر کے کمرہ سے باہر نکلی اسلم کپڑے پہنے کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ذرا رکی۔
"آپ کہیں جا رہے ہیں ؟
"ہاں" کیوں؟
"عشرت کے یہاں جاتی
"میں نہیں جاؤں گا۔ تم جا سکتی ہو، کس قدر روکھا پن تھا اس کے جواب میں، "میں نہیں جاؤں گا تم جا سکتی ہو" ہمیشہ کی طرح سے خشک انداز، جب بھی کبھی زہرا نے پیار سے کچھ کہا اور جواب ملا اس کے برعکس کیا۔

اس کی یہی زندگی ہے، ہر بات مرضی کے خلاف ـــ اسلم نے آج تک اس کو پیار سے زہرا نہیں پکارا تھا، اور نہ ہی کبھی اس کے بالوں کو چھوا تھا۔ وہ دونوں ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور تھے، ان کے مذاق جداگانہ تھے لیکن سوسائٹی کی نگاہ میں وہ ایک دوسرے کے شریک حیات تھے۔ مسز زہرا اسلم وہ ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ لکھا کرتی تھی گویا یہ بھی اس کا ایک فرض تھا یا وہ اس کے لکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ لیکن ویسے اسلم زہرا کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا اور زہرا کی جوانی چیختی تلملاتی رہی۔ اس کے آنسو تکیہ کو نم کرتے رہے۔

پھر ایک روز اسلم نے زہرا کا تعارف عشرت سے کرا دیا۔ یہ ہیں میرے دوست عشرت۔ اور آپ کی تعریف یہ ہے کہ آپ شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں اور بہت سنجیدہ انسان۔"

"یہ تھی اس کی پہلی ملاقات"

وہ دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ زہرا کو محسوس ہوتا اس نے اپنی زندگی کی کمی کو پورا کر لیا ہے۔ لیکن عشرت کے جانے کے بعد وہ اپنی غلطی کو محسوس کرتی کہ جن تیز دھارے میں وہ بہی جا رہی ہے وہ غلط ہے وہ ایک زبردست غلطی کر رہی ہے، اس نے بارہا سوچا وہ عشرت سے ملنا جلنا بالکل بند کر دے گی۔ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے گی، لیکن اس کے خیالوں کا محل ایک دم گر جاتا ـــ اسلم کی بے وفائیاں بے رخی اور روکھا پن

دوسری طرف عشرت کی محبت، ہمدردی، دلکش باتیں، اس کے قدم ڈگمگا جاتے۔
"خدایا وہ کیا کرے؟ کس طرح سے زندگی کے کٹھن راستوں کو طے کرے
یہ اونچے نیچے راستے اس کو اس کی منزل سے دور لئے جارہے تھے
پھر وہ کیا کرے —— پھر کیا کرے؟

ایک روز شام کو اسلم سے کسی بات پر وہ لڑی تھی اور اس شام کو جی بھر کر وہ روئی تھی۔ اسلم نے اس کو منایا بھی نہیں اور نہ ہی تسلّی دی، بلکہ وہ اس کو روتا چھوڑ کر اپنی تفریح کی دنیا میں چلا گیا اور وہ کمرے میں اکیلی روتی رہی، اسلم کے جانے کے بعد ہی عشرت آیا "زہرا" اس نے بڑے پیار سے اس کو پکارا اور جب زہرا نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں تو ان میں آنسو چھلک رہے تھے۔

"تم رو رہی تھیں، اس کی آواز میں کس قدر لوچ تھا اور زہرا ایک روتے ہوئے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ کرسی کے پاس ہی کھڑا تھا، جہاں زہرہ بیٹھی ہوئی تھی، کس قدر معصومیت تھی اس کے چہرے پر، کتنی ہمدردی تھی اس کی نگاہوں میں —— عشرت نے پہلی بار اس کے بالوں کو چھوا، جو زہرا کے ماتھے پر بکھر آئے تھے ریشم کی طرح ملائم۔
"میری طرف دیکھو"

آنکھیں بند کرلیں۔

"عشرت۔ تم نے دیکھا۔ وہ تارا جانے کس کا تھا

"ہاں نہ جانے کس کا سہارا ٹوٹ گیا"

وہ دونوں چاند کے انتظار میں لیٹے رہے، بڑی دیر کے بعد چاند نکلا

"زہرا"

"ہوں"

وہ اپنی پسندیدہ غزل سنا دو "دل لذتِ غم کی نعمت پہ بیجا نہیں جتنا ناز کرے"

اور اس نے آہستہ سروں میں گایا

دل لذتِ غم کی نعمت پہ بیجا نہیں جتنا ناز کرے
پا جائے تو اے ہنسنے والے تو مجھ سے زیادہ ناز کرے

تاروں پہ فلک پھولوں پہ چمن، ذرّوں پہ صحرا ناز کرے
کچھ اس سے الگ اے حسنِ عطا دل جس پہ ہمارا ناز کرے

بازیچۂ الفت میں دل کے کیا الٹی سیدھی چالیں ہیں
ہو جیتنے والا شرمندہ اور ہارنے والا ناز کرے

حد سے نہ گزر سیلاب نہ بن چکر میں نہ پھنس گرداب نہ بن
بن ہلکی موج مگر ایسی جس موج پہ دریا ناز کرے

اور اسی طرح بہت سے دن گزر گئے، پھر ایک دن عشرت نے زہرا کو

بتلایا کہ اس نے اپنا نام انڈین ایر فورس میں لکھوا لیا ہے۔ اس دن وہ بہت غمگین
تھا۔ اس نے مجبوراً ایسا کیا تھا۔ اسلم بات بات پہ زہرا سے لڑتا تھا جس کا باقی
وہ تھا۔ وہ چاہتے تھا وہ ان دونوں کے راستے سے ہٹ جائے۔ تاکہ زہرا
کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے ـــــ وہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے چلا گیا
زہرا تڑپتی رہ گئی۔

مدراس سے وہ اس کو اکثر خطوط لکھتا تھا۔ بہت اداس سے خطوط۔
اپنے ایک خط میں اس نے زہرا کو لکھا تھا
"زہرا کل میں تمہارے گلابی تارے کے بالکل قریب سے اڑا تھا اور
اس وقت مجھے خیال آیا کاش تم بھی میرے ساتھ ہوتیں تو ہم دونوں
اپنے تارے چھو لیتے"
اور زہرا نے کئی بار اس خط کو پڑھا تھا۔ اس نے آسمان اور تاروں کو
دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں نہ
آسمان ہو اور نہ تارے ـــــ دیوانہ ہو!

ایک صبح اس نے اخبار میں پڑھا، مدراس میں ایک ایروپلین میں آگ
لگ گئی جس میں عشرت بھی تھا۔
اور زہرا پہ جیسے بجلی گر پڑی"

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ عشرت مر جائے ، وہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا جب تک اس کا تارا نیلے آسمان پہ آنکھیں جھپکاتا رہے گا۔ عشرت مر نہیں سکتا یہ ناممکن ہے وہ زندہ ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ایک ہفتہ بعد مدراس سے اس کا سامان واپس آیا ، اس میں زہرا کے خطوط تھے جو اس نے عشرت کو لکھے تھے ، اور کچھ ایسے خطوط بھی تھے جن کو عشرت نے ادھورے ہی لکھ کر چھوڑ دیئے تھے ، خدا جانے کیوں نہ وہ ان کو مکمل کر سکا اس کی ہر کتاب پہ زہرا کا نام لکھا ہوا تھا ـــــــ اسلم نے وہ کتابیں اور خطوط زہرا کے منہ پر پھینک دیئے وہ غصہ میں کھڑا کانپ رہا تھا۔
"میرے گھر میں اب تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ، اب تم ہمیشہ کے لئے اپنے گھر جا سکتی ہو"
اور جانے سے قبل زہرا نے ایک اچٹتی ہوئی نظر آسمان پہ ڈالی ـــــــ عشرت کا تارا مسکرا مسکرا کر آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اسی وقت زہرا کا گلابی تارا بڑے زور سے ٹوٹا اور آسمان پر سفید لکیر بناتا ہوا مٹ گیا ، زہرا نے اپنی آنکھیں جھکا لیں " خدایا عشرت کا تارا ہمیشہ چمکتا رہے
اور وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پہ سے گزرنے لگی اور نیلے آسمان پہ تارے ہنستے رہے ۔

پلنگ پر لیٹے لیٹے اس نے ایک انگڑائی لی ــــ اس کے جسم میں ہلکا ہلکا درد سا ہو رہا تھا۔ اور اسکی آنکھیں رات کی جاگ سے دکھ رہی تھیں، جیسے کنکر بھر دئے ہوں کسی نے۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور آئینہ کے سامنے بیٹھ گیا، اس کے چہرہ پر ہلکی سی ایک شریر مسکراہٹ تھی۔ اس نے سگرٹ کیس کھولا اور بڑی نفاست کے ساتھ ایک سگرٹ سلگائی اسکے نیلگوں دھوئیں گہری فضا میں بکھیر دئے۔ سگرٹ پیتے وقت اس نے غور سے اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک ہلکا سا دانت کا نیلا نشان چمک رہا تھا وہ بڑی دیر تک اس نشان کو دیکھتا رہا اور اپنے ہاتھ سے آہستہ آہستہ اس کو سہلاتا رہا ــــ وہ ایک دم مسکرا اٹھا اس کی نگاہوں میں کل رات کے واقعات ایک ایک کر کے سامنے آ گئے۔

برسات کی بھیگی بھیگی رات تھی اور آسمان پر ایک تارا بھی نہ تھا سوائے رم جھم رم جھم کی آواز کے ــــ وہ اپنے بہترین لباس میں ملبوس، ہونٹوں میں سگرٹ دبائے آملی کے گھر گیا تھا، جیسے ہی اس کی ہوک پورٹیکو میں رکی، اس نے آملی کی نقرئی آواز سنی تھی شاید وہ اپنے کتے سے کھیل رہی تھی

وہ آہستہ سے کار سے اترا، برساتی اتار کر اس نے کار ہی میں رکھ دی اور بڑے
تکلف سے مسکراتا ہوا اس کے کمرے میں گیا تھا، وہ اس کا شاید انتظار ہی
کر رہی تھی، اس کے بال بکھر کر چہرے پر آ گئے تھے، اور اس کی سیاہ آنکھوں
میں تاروں کی سی چمک تھی اس کا تنگ لباس جس میں اس کے جسم کا ایک ایک حصہ
الگ نظر آ رہا تھا، سعید کا جسم حسن کو بیباک دیکھ کر پاگل سا ہو گیا۔ اس کے
قدم تیزی سے آگے بڑھنے لگے، اس کی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ کانپ
رہی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شنی نال نمبرا کی خوشبو اس کے
دماغ میں گھسی جا رہی تھی۔ وہ بہت دنوں سے آلی کو جانتا تھا نیو ایر نائٹ پہ
وہ اس سے ایم، بی کلب میں ملا تھا اور اپنی پہلی ہی ملاقات میں اس نے اپنے
حواس کھو دئے تھے ——— ہر مرد کی طرح ہر بچے کی عادت
کے مطابق وہ اس کو حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ آلی کو
اپنی پوری مردانہ طاقت سے بھینچ لے، اس کے سرخ ہونٹوں کو جس پر لپ اسٹک
بہت احتیاط سے لگائی گئی تھی اتنے پیار کرے اتنے پیار کرے کہ وہ نیلے پڑ جائیں
اور اس کے بالوں کے خم کو بگاڑ کر رکھ دے، جن کو وہ بڑی محنت سے بناتی
تھی اور پھر وہ آلی کے دل و دماغ پہ چھا جائے کہ وہ کسی دوسرے مرد کا
تصور بھی نہ کر سکے۔

عورت طاقت چاہتی ہے ——— اور اس کی کمزوری ہے مرد کی باتیں

اس کی تعریف، اس کے حسن کی تعریف، اس کی جوانی کی تعریف، اس کی دلربائی کی تعریف، اور پھر شیطان ہزار مرتبہ اس کے کان میں کہے گا تو حسین ہے تو پھول ہے، تجھ میں شراب سے زیادہ خمار ہے، تو موسیقی سے زیادہ ہوش کن ہے،

سعید کے پاس طاقت تھی، عورتوں کا دل موہ لینے والی باتیں، وہ اپنے فن کا ایک کامیاب مرد تھا اور آملی سعید سے اپنے کو نہ بچا سکی۔

اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے۔

سعید نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے سگرٹ کو آتش دان میں پھینک دیا اور آملی کا چہرہ اور کان ایک دم سرخ ہو گئے۔

سعید نے محسوس کیا اس کا جسم بیحد سخت تھا، اس کے پیار اس قدر عجیب اور نئے تھے جو اس نے پیشتر کبھی محسوس نہیں کئے تھے۔ اس کی نگاہیں بند ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ لمبی لمبی گھنی پلکوں نے اپنی آغوش میں چھپا لیا اور اس کی روح کیف آور شباب تلے دب گئی۔

"آملی، مائی لو، کبھی کبھی اس کی آواز سنائی دیتی اور پھر ایک سکوت چھا گیا ——— ایک طویل خاموشی!

بڑی دیر کے بعد وہ بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا ——— وہ سوچ رہا تھا وہ آملی کی زندگی میں پہلا مرد نہ تھا۔ بلکہ اس کے قبل کوئی اور مرد اس کی زندگی

میں آچکے تھے۔ شاید اس سے زیادہ حسین، اس سے زیادہ طاقت ور اور
آملی اس کے رخسار کے نیلے نشان کو دیکھ رہی تھی ـــــــ دانتوں کا ایک
چھوٹا سا نشان۔

وہ بڑی رات تک آملی کی آغوش میں ایک بچے کی طرح لیٹا رہا جب وہ
اپنے گھر آ رہا تھا تو وہ خدا حافظ کہنے کے لئے کار تک آئی ـــــــ وہ اندھیرے
میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

کار گراج میں رکھ کر وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہوا، اس کی
بیوی اپنے پلنگ پہ بےخبر سو رہی تھی۔ وہ آہستہ قدم کپڑے بدل کر اپنے بستر پہ
لیٹ گیا ـــــــ اس کے چہرے پہ خوشی تھی اطمینان تھا
وہ بڑی دیر تک سو نہ سکا۔

صبح جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھا۔ اپنے چہرے کے نشان کو دیکھ
رہا تھا کہ کھٹ کھٹ کرتی اس کی بیوی آگئی۔ وہ چونک سا گیا۔ جیسے کسی
نے اس کے خوابوں کا طلسم توڑ دیا ہو۔

"ارے ابھی تک آپ نے شیف نہیں کیا؟"

"نہیں تو" وہ گھبرا کر بولا۔

"چائے منگواؤں"

"ضرور"

"کل رات مشاعرہ کیسا رہا" وہ مسکراتی ہوئی بولی

"بہت خوب" وہ صفائی سے جھوٹ بولا

"کون کون شعرا آئے تھے ؟

حفیظ، فراق، جگر، جوش، آرزو، اثر وغیرہ

تو بہت لطف رہا ہوگا

ہاں" اور تم بہت یاد آئیں، وہ ایک بار پھر جھوٹ بولا

"سچ" وہ شرمانے لگی

"بخدا"

"ارے یہ آپ کے رخسار پر نشان کیسا ؟" اس نے اپنی انگلی سے چھوتے ہوئے پوچھا ——— "او" چوٹ لگ گئی تھی، کل رات کو، وہ مسکرا رہا تھا

"چوٹ ——— کتنی چوٹیں کھاتے ہیں آپ ——— لائیے پوڈر لگا دوں

"شکریہ ——— اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ دبا دیا، تمہارے بغیر میری زندگی نامکمل ہے رضیہ۔

اور وہ اپنے شوہر کی محبت پر مسکرا رہی تھی ——— کس قدر چاہتا تھا وہ!

آگ جلتی رہی

خوابوں کے ساحل میں نہ جانے وہ کب سے غوطے لگا رہی تھی ۔ موسم گرما کی سفید چاندنی درختوں پر بکھری ہوئی تھی اور وہ ابھی ابھی غسل کر کے نکلی تھی اس کی بالوں کی لٹوں میں سے اب بھی پانی کی بوندیں گر رہی تھیں ۔ آج وہ اتنی ہی حسین معلوم ہو رہی تھی جیسی یہ چاند کی روپہلی کرنیں ——— اس نے گھاس پر لیٹے لیٹے ہارسنگھار کی پتیوں کو ہتھیلی پر مسلتے ہوئے چاند کو دیکھا ، اس کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی ، اور چاند نیلے آکاش پر قہقہے لگا رہا تھا اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں ، اس کا دل مرجھا کر رہ گیا ، اس کو محسوس ہوا جیسے یہ تنہائی اس کو نگل جائے گی ، اتنا بڑا سا گھر اس کو کھانے لگا ، اور یہ چاند یوں ہی ہنستا رہے گا ، اور کوئی انسان اس کی بیکسی پر دو آنسو بھی نہ بہائے گا   اس کی زندگی بھی عجیب تھی ——— ——— بالکل عجیب !

صبح سے شام تک وہ سوچا کرتی ، اپنی قسمت سے لڑا کرتی ، اس کو اپنی قسمت سے بہت سی شکایتیں تھیں ، وہ سکون پانا چاہتی تھی ، اصفہان کی نیند لیکن اس کی زندگی ناسور بن کر رہ گئی تھی ، جو ذرا سی ٹھیس پر رسنے لگتا اس کا ماحول اس کے عزیز اس کو کچھ اور بنانا چاہتے تھے اور وہ اس وقت

ان سب کے خیالوں سے بالکل مختلف سوچتی۔
کالج سے آکر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کتابیں میز پر رکھ کر وہ سامنے والی کھڑکی کھول کر پہروں کھڑی رہتی۔ سامنے لان میں موسمی پھولوں کو دیکھا کرتی اور اس کے کھڑکی کے قریب جو وگن ویلا کی بیل لگی تھی جس میں اودے رنگ کے پھول لگے تھے، ایک زمانے میں اس نے اپنے ہاتھ سے یہ بیل لگائے تھے، اور اب کی گرمی میں اس میں اس قدر پھول آئے تھے کہ ذرا سی جنبش پر ڈھیروں پھول ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے کمرے میں آجاتے لیکن اب اسے اس بیل سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ کئی کئی دن گذر جاتے اور وہ اس میں پانی تک نہیں ڈالتی تھی، لیکن پھول تھے کہ نکلتے چلے آتے، جب اس کی ٹانگیں کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو وہ پلنگ پر آکر بیٹھ جاتیں "FOREVER AMBER" کے صفحوں کو پلٹتی یہ ناول وہ اپنی ممی سے چھپا کر نادرہ سے لائی تھی، نادرہ نے اس ناول کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیا تھا وہ کہتی تھی "کلثوم اگر تو نے یہ ناول نہیں پڑھا تو کچھ بھی نہیں پڑھا" اور وہ اپنی ممی سے چھپا کر سائنس کی کتابوں کے نیچے رکھ کر بالکل چوروں کی طرح لائی تھی اور پچھلے ایک ہفتہ سے کالج کی واپسی پر وہ یہ ناول پڑھ رہی تھی، اکثر پڑھتے پڑھتے اس کو جھرجھری سی آجاتی اس کے رخسار ایک دم سرخ ہو جاتے اور جسم بھر میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔

ناول کی حسین ہیروئن ایمبر جب اپنے عاشق لارڈ کارٹن سے تنہائی میں ملتی اور اس کے بہت سے عاشق تو کلثوم سوچنے لگتی کہ کیا عورت اپنی زندگی میں بہت سے مردوں سے محبت کر سکتی ہے؟ کیا وہ اپنے جسم کو اتنی آسانی کے ساتھ ہر نوجوان مرد کے حوالے کر سکتی ہے؟ جس طرح ایمبر نے کیا اور یہاں تک وہ کنگ چارلس سکنڈ کے حرم میں پہنچ گئی اس رات وہ بڑی دیر تک جاگتی رہی، گھڑی گھڑی کروٹیں بدلتی رہی اور وہ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

—— رات کے سائے طویل ہوتے گئے اور اکیلے کمرہ میں کلثوم کی جوانی اور گرم گرم سانسیں آپس میں الجھتی رہیں۔

اس کی ماں عرصہ سے کلثوم میں ایک تبدیلی دیکھ رہی تھی، ایک ایسی تبدیلی جو پیشتر کبھی نہ تھی، جب سے اس کے یہاں کے مہمان گئے تھے، کلثوم مضمحل سی ہو کر رہ گئی تھی —— صبح کے ناشتے میں اس نے مکھن ٹوسٹ کھانا چھوڑ دیا تھا، صرف چائے کی ایک پیالی پی کر کالج چلی جاتی، اس کی ماں کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ کلثوم کیا چاہتی ہے۔ آخر اس کی زندگی میں کون سی ایسی کمی ہو گئی ہے، اس کے خیال میں ایک شریف خاندان کی لڑکی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ آرام اور عزت کے ساتھ اپنے گھر میں رہے بچپن میں اپنے بھائی بہنوں کو چاہے، ہوش سنبھالنے پر گھر کا کام کاج کرے جوان ہونے پر اپنے شوہر سے محبت کرے، ہندوستان کی آبادی بڑھائے اور

کلثوم اس وقت نہ جانے کیا سوچتی ؟ اس کے رخسار آگ کی طرح جلنے لگتے اور وہ اپنے آپ سے شرما جاتی اور وہ سوچنے لگتی ، تین مہینے گزرے ایک رات سوتے سوتے اس کی ماں نے اس کو جگایا تھا ، کلثوم اٹھو ، دیکھو مہمان آئے ہیں، وہ آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی ۔ اس کا پیازی رنگ کا ڈوپٹہ آدھا اس کے پیروں پر پڑا ہوا تھا ۔ نیند سے اس کی آنکھیں جھپکی جا رہی تھیں ۔ " اری لڑکی آنکھیں تو کھول کر دیکھ ، یہ سب کون کھڑے ہیں ۔ اور کلثوم نے ایک دم نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ بغیر چپل کے اپنے کمرے کی طرف بھاگی ، اپنا آنچل سنبھالتی ہوئی ۔ ریحانہ اور ذکیہ اس کے پیچھے دوڑیں کلثوم باجی ، اور اسلم وہیں ــــ کھڑا رہ گیا ۔

صبح کے ناشتے پر وہ نیچی نیچی نگاہیں کیے سب کے ساتھ چائے پی رہی تھی کلثوم کو محسوس ہوا اسلم حسین ہے اور اس کی بڑی بڑی نگاہیں جن کو لمبی لمبی پلکوں نے اپنی آغوش میں چھپا رکھا تھا ، بہت معصوم ہیں ،

اور اسلم کلثوم کی جسم کی نزاکتوں کو دیکھ رہا تھا ، وہ دونوں خاموش تھے ، اس نے اپنی پہلی ملاقات میں اپنی لرزتی ہوئی روح کو اسلم کی روح سے ہم آہنگ پایا تھا ، جیسے اس کی ویران دنیا میں ایک جگمگاتا تارا نکل آیا ہو ۔

چاروں صحن میں ٹہل رہے تھے ، ذکیہ کی فرمائش پر وہ لوگ برج

کھیلنے کے لئے تیار ہو گئے، ریحانہ کی خواہش تھی کہ وہ کلثوم باجی کے پاٹنر بنے اور کلثوم سوچ رہی تھی، کاش وہ اسلم کی پاٹنر بنتی، لیکن نہ تو اسلم نے اس بات کی خواہش کی اور نہ کلثوم نے کچھ کہا، کھیل شروع ہوا، ڈیل اسلم کی تھی وہ "ٹو نو ٹرمپ بولا، کلثوم تھری اسپیڈ، بولی۔ ذکیہ ریحانہ نے پاس کیا اسلم اپنا گیم بنانا چاہتا تھا، اس نے کال بڑھائی۔ وہ تھری نو ٹرمپ گیا کلثوم نے فور اسپیڈ بولے، اسلم نے ڈبل کیا، دوسرے پاٹنر نے پاس کیا ڈمی کھولی گئی تو کلثوم کا سر چکرا گیا، نہ سائڈ کارڈ تھے اور نہ ٹرمپ اسلم نے مسکرا کر کلثوم کو دیکھا۔

"کیا خیال ہے" آپ کتنے سے ہار رہی ہیں۔

"شاید تین سو سے" وہ ہنس دیا، شاید اس سے بھی زیادہ،

سچ پوچھئے تو مجھے ترس آ رہا ہے،

"بڑے رحم دل ہیں آپ؟

"اگر یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لیجئے"

"اور اگر آزمائش میں آپ ہار گئے تو"

"کیا مجال"

"لیکن بھیا ہمیں آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں، آخر میں فتح ہماری ہوگی، ریحانہ بولی اور وہ خاموشی سے سگرٹ پیتا رہا۔

کلثوم سوچ رہی تھی فتح کس کی ہوگی ، اسلم کی یا اس کی ، لیکن اس کی تو قسمت میں ہار ہی ہار رہی ہے ، جیت کا نام بھی نہیں ہے ——— یہاں تک وہ ایسی ایسی کئی بازیاں ہار گئی اور کھانے سے پہلے کھیل ختم ہو گیا وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اٹھ بیٹھی جو اپنی آخری پونجی بھی ہار گیا ہو اسلم ہنس رہا تھا آپ ہی بتلائیے ہم عورتوں کے ساتھ کیا کھیلیں ، اتنی رعایت پر بھی آپ ہار گئیں مجھے افسوس ہے ۔

وہ مسکرا دی ، جو ہارنے میں مزہ ہے وہ جیتنے میں نہیں ، کبھی ہار کر دیکھئے وہ ڈوپٹہ کے کنارے کو مسلنے لگی ۔

" معاف کیجئے گا ، ہم کو تو جیتنے میں مزا آتا ہے وہ مسکرا رہا تھا اور مجھے ہارنے میں ، اس کی آنکھوں میں کچھ نمی تھی ۔

رات کو جب وہ سونے کے لئے لیٹی تو وہ بار بار سوچ رہی تھی ، وہ سچ مچ ہار گئی تھی ، آگ کی چنگاریاں اب شعلہ بن کر اس کو پھونکے دے رہی تھی ، اس کا دل اتنا دھڑکتا اتنا دھڑکتا کہ وہ گھبرا جاتی اور اس وقت اس کو خیال آتا کہ خدا جانے اسلم بھی اس کی بابت ایسا ہی سوچتا ہے یا نہیں اور پھر آسمان پر رات کے سناٹے میں کوئی اکیلا پرند سائیں سائیں کرتا ہوا اس کے سر کے اوپر سے گذر جاتا اور وہ سہم کر رہ جاتی ، وہ بھی تو بھیگی پلکیں اور زور شور سے بہنے لگتی ۔

کلثوم نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اسلم کو چاہا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا مرد تھا۔ اور اسلم نے اس میں آسمان کی سی وسعت پائی تھی، وہ چاہتی تھی وہ آزادی کے ساتھ اس کے سائے تلے آکر کھڑی ہو جائے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی اور آگ کے شعلے اس کو اپنی گرمی سے جلاتے رہے، وہ دونوں خاموش تھے۔

ایک روز جب وہ لوگ پکچر سے واپس آئے تو گھر سے اسلم کے نام تار آیا ہوا تھا، لکھا تھا

"فاخرہ بیمار ہے فوراً آؤ"

اور اس رات کلثوم کو بالکل نیند نہیں آئی، وہ کسی کی زندگی کا سہارا تھا وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھی۔ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی، وہ کسی کی خوشیوں کا خزانہ چرانا چاہتی تھی، وہ فاخرہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھین کر خود قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ لیکن کیا وہ ایسا کر کے خوش رہ سکے گی، اور اس کی روح چیخ اٹھتی "کلثوم تیری ہار ہی تیری جیت ہے"۔

وہ صبح کی ٹرین سے واپس جا رہا تھا، اس رات چاندنی اپنے پورے شباب پر تھی، اور جب سب سو گئے تو وہ دبے پاؤں اپنے پلنگ پر سے

اٹھی اور آہستہ قدم باہر صحن کی طرف گئی۔ ہارسنگھار کے درخت کے قریب اس کا پلنگ بچھا تھا۔ اور وہ غافل سو رہا تھا، اس کے چہرے پہ چاندنی کرنیں پڑ رہی تھیں، وہ شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پہ ایک عجیب سی معصوم مسکراہٹ تھی، جو اس سے قبل اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی

وہ چپ چاپ ہارسنگھار کے نیچے اس کو کھڑی تکتی رہی ۔۔ اس کا دل چاہا وہ اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اسکے ہونٹوں میں پیوست کر دے اور چپکے سے اس سے کہہ دے کہ وہ اس کو چاہتی ہے اس کو پیار کرتی ہے لیکن اس کے قدم ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے ۔۔۔۔۔ صرف اس کے گرم گرم آنسو مچل کر گھاس پہ گر پڑے ۔۔۔۔ اور وہ آہستہ قدم ایک الوداعی نگاہ ڈالتی ہوئی اپنے پلنگ پہ واپس چلی آئی وہ سوچ رہی تھی ایک بار اس نے اسلم سے کہا تھا

"ہارنے میں جو مزا ہے وہ جیتنے میں نہیں"

اور وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی آخری پونجی لٹا کر بیٹھی ہوئی تھی ۔۔۔۔ شکستہ اور مجبور!

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو چاروں طرف پابندیوں میں جکڑا ہوا پایا، ماں باپ کا اس قدر لارڈ پیارا تھا کہ اس کو اسکول میں بھی کسی کھیل کود میں بھی حصہ لینے کی اجازت نہ تھی، سوائے اس کے کہ جو کھیل ہو، وہ گھر کے اندر ہی کھیلا جائے، صحن میں فٹ بال ہو رہا ہے تو کبھی ہاکی، اکثر گیند اچھل کر باورچی خانہ کے اندر جا گرتا، جہاں سے باورچی کی روتی سی آواز آتی۔

"میاں گیند ذرا سنبھال کر کھیلئے، دیکھئے چولھے پر سے پتیلی گرتے گرتے بچی۔"

اور صحن میں سے آوازیں آتیں

"ابے میاں کے بچے گیند جلدی واپس کر دیر ہو رہی ہے"

اور وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ پھر کھیل میں مشغول ہو جاتا

دبلا پتلا سا، بہترین ٹانک پینے کے باوجود بھی، اس پر گوشت کی بوٹی نہ چڑھتی، اندر کو دھنسا ہوا سینہ، جس میں ابھار نام کو بھی نہ تھا، گو اب وہ اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا، اور اس کے سینے پر گھنے گھنے سیاہ بال نکل آئے تھے، لوگ کہتے ہیں، بچپن میں اس کی صحت خراب ہو گئی تھی وہ ایسے لڑکوں

کے ساتھ ہاکی اور فٹ بال کھیلا جو بدنام تھے اکثر گھر کے لوگوں نے اسے اس لڑکے کے ساتھ اکیلے کمرہ میں دیکھا جن کے دروازہ اندر سے بند کر لئے جاتے تھے اور کبھی کبھی اندر سے باتوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، لیکن سمجھ میں خاک بھی نہ آتا تھا، ماں باپ مطمئن تھے کہ ان کا بیٹا گھر سے باہر تک قدم نہیں نکالتا ہے، خدا ایسی اولاد سب کو دے، انھیں بڑا فخر تھا، ایک روز اس کی دلھن لائی گئی، بڑے چاہ و پیار سے وہ لال چمکوں کے کپڑوں میں لپٹی، اس کے گھر لائی گئی، اس کے جسم سے خوشبوؤں کی تیز مہک آ رہی تھی، اور اس کے چہرے پر افشاں بکھری ہوئی تھی، گھر بھر میں ادھم ہو رہا تھا۔ مہمان باری باری دلھن کو دیکھ رہے تھے، سب رسمیں ادا ہونے کے بعد وہ رفیق کے کمرے میں پہنچا دی گئی۔ فیضو نے بالکل چپکے سے گھونگھٹ کی آڑ سے کمرہ کا جائزہ لیا، اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، وہ خود حیران تھی کہ کیا کرے، "یا اللہ، یا اللہ" وہ بار بار کہہ رہی تھی، سسرال جانے سے پہلے اس کی چنچل بہنوں نے نہ جانے اس سے کیا کیا کہہ دیا تھا کچھ بیہودہ سی باتیں جن کو سوچ سوچ کر وہ پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھیں اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ پچھلے سال بھیا کی شادی پر جب دلھن گھر میں آئی تو وہ سب لڑکیاں ہٹا دی گئی تھیں، اور بھیا مسکراتے ہوئے بڑی شان سے اندر گئے تھے جہاں دلھن بیٹھی تھی تو اس وقت بھی اس کا دل اتنی ہی تیزی سے دھڑکا تھا

صفو اور آپا گھسر پھسر کرتی پھرتی ہیں اور بار بار بڑوں کی نظریں بچا کر اسی کمرے کے چکر کاٹتیں جہاں دلہن اور بھیا تھے، اس کمرے کی کھڑکی جو کہ اندر سے بند تھی اس کھڑکی کے دروازے پہ کان لگا لگا کر سنتیں اور ایسے منہ بناتیں کہ ان کے چہرے سرخ ہو ہو جاتے اور ذرا سی کسی کی قدموں کی آہٹ پا کر بھاگ جاتیں صبح ناشتہ کے لئے بھیا جب کمرے سے نکلتے تو جیسے کوئی مجرم گردن جھکائے غسل خانہ کی طرف بھاگے۔ اور گھر بھر دلہن کے کمرے کی طرف ٹوٹ پڑا۔ بھابی روئے جارہی تھیں ان کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، پلنگ پر دھانی چوڑیوں کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔ صفو اور آپا کونے میں کھڑی مسکرا رہی تھیں ـــــ دفعتاً کھٹ سے دروازہ کھلا اور وہ اندر آگیا۔ فیضو چونک سی پڑی ـــ ہائے اللہ اس نے کس کے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اس کا دل اچھلنے لگا ـــــ وہ آہستہ سے پلنگ کے قریب آیا اور دوسری طرف کروٹ کر کے لیٹ رہا۔

فیضو جاگتی رہی نہ جانے کب تک، وہ سوچ رہی تھی آپا کتنی شریر ہیں۔ خواہ مخواہ اس کو ڈرا دیا اور وہ اس ڈر میں سو بھی نہ سکی ـــــ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے چہرے پہ افشاں چم چم کر رہی تھی۔

دن پہاڑ سے گزرنے لگے، عمر آگے بڑھتی چلی گئی اور فیضو مرجھاتی چلی گئی، اس کی آنکھوں کی چمک نہ جانے کس نے چھین لی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں پڑی کڑھتی رہتی تھی۔

رفیق بھی بدلتا گیا۔ وہ زیادہ اپنے دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر پھرتا۔ اکثر لوگوں نے اسے غلط جگہ پر دیکھا۔ اندر سے باہر تک چھپے ہوتے کوئی کہتا "رفیق چوک جاتا ہے"

دوسرا کہتا "ہٹو بھی اس کی بیوی تو پڑی اپنی قسمت کو رویا کرتی ہے، جب وہ ایک کو نہ خوش کر سکا تو دوسری پاس کیسے جائے گا؟

کوئی کہتی "اتنا علاج بھی تو کرایا تھا اس نے، ابھی تک دوا کرتا رہتا ہے،

کوئی تجربہ کار بڑھیا بولتی "نگوڑے کو ہوس ہے ہوس اکثر کمزور مردوں کو ہوس ہو جاتی ہے۔ اور خاک بھی نہیں۔

فیضو سب کچھ سنتی، سب کچھ دیکھتی، اس کی نس نس آگ کی طرح جلنے لگتی اور اتنی انگڑائیاں آتیں اتنی انگڑائیاں کہ اس کا جسم دکھنے لگتا پھوڑے کی طرح وہ سوچتی، جیسے اس کی زندگی ایک سمندر کی طرح ہے، پانی میں طوفان آتا ہے بے پناہ طوفان، موجیں بیقراری سے اٹھتی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی دور نکل جاتی ہیں، وہ چاہتی ہے اس پانی کے بہاؤ کو روک دے، ان بیقرار لہروں کو ساکت کر دے، پھر وہ سوچتی ہے اس کے صرف دو ہی راستے ہیں، اگر اس نے پانی کے بہاؤ کو کسی بھاری پتھر سے روک بھی دیا تو ایک روز یہ پانی سڑ جائے گا۔ اس میں کیڑے پڑ جائیں گے اور ایسی بدبو نکلے گی جس سے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ ورنہ پھر یہ طوفان یونہی آتے رہیں گے تو کیا

روز یہ طوفان پتھر کے سینے کو چیرتا ہوا نکل جائے گا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے گی۔ اس کی زندگی سمندر اور طوفان کے مانند بن کر رہ گئی تھی، جس میں روزانہ طوفان آتے تھے جذبات کو روکنے کے لئے، اس نے اپنے سینے پر پتھر رکھ لئے تھے وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی، اس رات اسے بڑی دیر میں نیند آئی جس قدر وہ گہرا سوچتی اتنا ہی سکون اس سے دور ہوتا گیا۔ وہ زندگی کی راہ پر بے سہارے کھڑی تھی نہ اس کا کوئی ساتھی تھا نہ ہمدرد، اس کا جسم آگ کی طرح جلنے لگتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم سے سڑی سڑی بو آرہی ہے، اس کے جسم میں کیڑے رینگ رہے ہیں، بدشکل سے کیڑے!! بالکل اس سمندر کے پانی کی طرح اور وہ پتھر جو اس نے اپنے کلیجے پر رکھ لیا تھا اور جس کے بوجھ سے وہ دبی جارہی تھی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اس کے دل میں بغاوت سی پیدا ہونے لگی اور اس کا دل چاہا وہ بھاری پتھر جو اس نے اپنے جذبات دبانے کے لئے اپنے سینے پر رکھ لیا ہے، اس کو اٹھا کر دور پھینک دے تاکہ وہ بوجھ جو وہ عرصے سے اٹھائے پھر رہی ہے اس سے چھٹکارا مل جائے ــــــ وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے پلنگ پر واپس چلی آئی۔ مجبوری۔

ایک روز شام کو فیضو اون لینے گئی جب وہ دوکان میں داخل ہوئی تھی اُس وقت اس نے دیکھا ایک کرنل دوکان سے باہر نکل رہا تھا، لیکن فیضو کو دیکھ کر وہ پھر دوکان کے اندر چلا گیا اور اس نے محسوس کیا کہ جب وہ اون

پسند کر رہی تھی اس کے تھوڑے فاصلہ پر وہ کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ ایسی نگاہوں سے جن کو دیکھ کر اس کے دل میں درد سا ہونے لگا۔ جیسے ہی وہ دوکان سے باہر نکلی وہ اس کے ساتھ ہولیا، فیضو کا دل دھک دھک کرنے لگا اور کرنل اس کا تعاقب کرتا رہا، تھوڑی دور چل کر وہ رک گئی، اس نے دیکھا وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں بالکل مجبور ہو گیا تھا، ورنہ ایسی جرأت نہ کرتا۔"

فیضو کھڑی کانپ رہی تھی"

"ارے تم تو سردی سے کانپ رہی ہو، اور اس نے اپنا کوٹ اس کے شانوں پر ڈال دیا ــــــ اگر اعتراض نہ ہو تو آؤ ہم کسی پاس کے ہوٹل میں چائے پی لیں"

"لیکن" فیضو کچھ سہمی،

"شرماؤ نہیں ــــــ تم بڑی حسین لڑکی ہو، اس اندھیرے میں بھی مجھے تمھاری سیاہ آنکھوں کو دیکھنے کی ہمت نہیں۔

وہ دونوں ہوٹل کے ایک علیحدہ کمرہ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے، اندر ہال میں ایک بہت ہی شوخ نغمہ بج رہا تھا،

تمھارے ہونٹ کس قدر سرد ہیں، تم اس قدر سہمی ہوئی بیٹھی ہو جیسے کوئی اڑتی ہوئی چڑیا کو پکڑ لے ــــــ شاید تم نے زندگی نہیں دیکھی ــــــ زندگی کے حسین ہنگاموں سے بہت ڈر رہی ہو، کچھ تو بولو، فیضو اس کو دیکھتی رہی ،

اس کے ابھرے ہوئے سینے کو جس پر رنگ برنگی مڈل لگے ہوئے تھے، اور اس کا جوان نشیلا سا چہرہ سیاہ گھرے بال اور مضبوط سے ہاتھ یہ سب کچھ اس کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام تھا،

کرنل نے اپنے ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑلی، اور فیضو کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، اسنے اپنے گرم گرم ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، جیسے ایک روتا ہوا بچہ ماں کی آغوش میں جاکر سو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح فیضو اس کی آغوش میں گر پڑی، اور اس کو محسوس ہوا جیسے اس نے اس بھاری پتھر کو اٹھا کر بہت دور پھینک دیا، جو بہت عرصے سے اٹھائے اٹھائے پھر رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی عورت بغیر مرد اسیطرح ہے جس طرح جسم بغیر روح کے۔

اور اس وقت رفیق اپنے کسی آوارہ دوست کے ساتھ کسی تھرڈ کلاس طوائف کے پاس بیٹھا گندے مذاق کر رہا تھا۔

سراب

وہ آہستہ آہستہ دریا کے قریب سے گذر رہا تھا، اس کی ہونٹوں میں دبی ہوئی سگرٹ گہرے نیلے رنگ کا دھواں چھوڑتے ہوئے آخری سسکیاں لے رہی تھی، برفیلی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس نے اپنے کوٹ کے کالر کو اونچا کر لیا وہ ابھی ہوسپٹل سے ایک عورت کا آپریشن کر کے آ رہا تھا۔ وہ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس دریا کے کنارے ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر لیٹ جائے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو بھلا دے ——— یہ دنیا ——— ہوسپٹل آپریشن، عورت اور رومانس سب کچھ بھول جائے ——— اور پھر ——— زندگی کو حسین بنانے کے لئے انسان کو ماضی بھول جانا ہی پڑتا ہے ورنہ ——— پھر زندہ کیسے رہے۔ آج کی باتیں کل صبح خواب بن کر رہ جاتی ہیں۔ ہلکی ہلکی یاد ——— دھندلی سی تصویریں ——— ! اس نے دوسری سگرٹ سلگائی، یکایک ایک پرچھائیں تیزی سے اس کے سامنے سے گزر گئی، اس نے سگرٹ کا ایک گہرا کش لگایا ——— سڑک پہ لگی ہوئی بجلی کی روشنی میں اس نے دیکھا، وہ ایک عورت تھی جو تیزی سے دریا کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ ذرا چونکا، رات کے گیارہ بجے اس سرد رات میں ایک تنہا عورت اور دریا ——— وہ تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا ——— وہ اس کے قریب پہنچ گیا، اس نے

مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی

"تم کہاں جارہی ہو" وہ کچھ لمحہ بعد بولا۔

"مجھے چھوڑ دو" عورت نے عاجزی سے جواب دیا، وہ اب بھی بدستور اس کی کلائی پکڑے ہوئے تھا۔

"لیکن تم جانا کہاں چاہتی ہو؟

"میں کہتی ہوں میری کلائی چھوڑ دو"

"عجیب بات ہے، میں تم سے ایک سوال کر رہا ہوں اور تم اس کا جواب نہیں دیتیں، میں پوچھ رہا ہوں اتنی رات گئے تم اکیلی دریا کی طرف کیوں جارہی ہو

"مرنے ــــ خودکشی کرنا چاہتی ہوں، اس نے دیکھا وہ بے اختیار بچوں کی طرح سے سسکیاں بھرنے لگی"

زندگی سے تھک گئی ہو شاید"

"ہاں بید" وہ بدستور روئے جارہی تھی،

"مگر تکلیفوں سے بچنے کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں" ــــ اس نے روشنی میں اس کی نگاہوں کو دیکھا، جن کی گہرائیاں بے پناہ تھی، ان کے ہاتھ کی گرفت ایکبارگی ڈھیلی پڑ گئی،"

"کیا تکلیف ہے تم کو؟"

"دنیا جینے نہیں دیتی" ــــ آج ایک ہفتہ ہوا مجھے میری ماں اس دنیا

میں اکیلا چھوڑ کر مر گئی، اب مجھ سے فاقے نہیں ہوتے، کب تک بھوکی رہوں، ایک جوان اکیلی عورت کے لئے یہ دنیا بڑی خطرناک جگہ ہے۔

"ہوں" وہ دور خلا میں کچھ ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہا تھا، اور سوچ رہا تھا دنیا کی ہر عورت خواہ وہ فاحشہ کیوں نہ ہو اپنے کو معصوم سمجھتی ہے، ایک فرشتہ سے زیادہ پاک، ہوسپٹل کی اکثر مریضہ اس سے گھنٹوں بات کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کا ہاتھ لے کر اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر رکھ کر کہتی ہیں "ڈاکٹر بہت تکلیف ہے" اور وہ مسکرا کر جواب دیتا "کم ہو جائے گا درد" اس کا خیال تھا، عورت کو عورت سمجھ کر پیش آنا چاہئے اور کچھ نہیں، اس سے زیادہ کی وہ مستحق نہیں، وہ جو کہتی ہے اس کو سن لو، عمل نہ کرو، اس نے اپنی جیب سے پرس نکالا۔

"لو" گھر واپس چلی جاؤ ——— دس دس کے پانچ نوٹ وہ اس کی طرف بڑھاتا ہوا جانے کے لئے مڑا ——— اور ہاں یہ میرا کارڈ ہے، اگر کبھی ضرورت پڑے تو میں تمہاری مدد کرنے سے انکار نہیں کروں گا

"لیکن" وہ ذرا رکی

"شرماؤ نہیں " ——— چلو میں تمہیں، تمہارے گھر تک تمہیں چھوڑ آؤں، اس کی آواز میں ہمدردی تھی،

وہ خاموش کھڑی رہی، جیسے اس نے مرنے سے بھی شکست مان لی ہو،

وہ دونوں آہستہ آہستہ سڑک پر آ گئے، بالکل خاموش، کافی دور جا کر وہ ایک گلی کی طرف مڑ گئی اور ایک چھوٹے سے مکان کے قریب جا کر رک گئی،

"شکریہ" ___ آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں ___ میرا نام زیب ہے" اس نے مسکرا کر کہا "یہ تو میرا فرض تھا"

وہ اپنے ہوٹل واپس آ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، یہ عورتیں بھی کتنی آسانی سے من جاتی ہیں، وہ جانتا تھا کہ غصہ کم ہونے کے بعد وہ ضرور اپنے گھر واپس چلی جائے گی: اس کو ایک دم ہنسی آ گئی، اس سے پیچھا چھڑانے کی بہترین ترکیب تھی، دلچسپ اور وہ کارڈ؟ زیب اس نے اپنا نام کیوں بتلایا؟ شاید اس لئے کہ وہ اس کا نام لے کر آہیں بھرا کریگا ـ

اونھ، اس نے تو اپنا فرض پورا کر دیا، ایک انسانی فرض کہ اس کو خودکشی کرنے سے بچا لیا، وہ تیز تیز قدم رکھتا ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا ـ رات کا ایک بج رہا تھا ___ صبح 9 بجے اس کو دو آپریشن کرنا تھے، اور وہ چند گھنٹے آرام چاہتا تھا، کمرے میں پہنچ کر اس نے بجلی جلائی، کپڑے بدلے اور پلنگ پر لیٹ گیا ـ تھکا تھکا سا تھا ـ

وہ آہستہ سے مکان میں داخل ہوئی ___ اس کی نیلی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہو گئی تھی، اب اس کو ڈاکٹر کے مکان کا پتہ جاننے میں دیر نہیں لگتا ـ

جیساکہ وہ اپنی ماں کے مرنے کے بعد محسوس کیا کرتی تھی، وہ اندھیرے میں مسکرائی،
جیسے اسے کچھ مل گیا ہو اور وہ اپنی فتح پر نازاں ہوا، اس نے آہستہ سے لیمپ
روشن کیا اور چپکے سے اپنی مٹھی کھولی، اس نے نوٹوں کو جان کر زمین پر گرادیا اور
کارڈ کو روشنی میں دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر محمود، کنگ جارج میڈیکل کالج

"محمود"۔۔۔ اس نے آہستہ سے نام کو دہرایا ۔۔۔ "محمود" پھر اس نے
اپنی کلائی کو آہستہ سے چھوا، اور اس کا جسم پھر سنسنانے لگا۔

اس نے اسی جگہ پر اس کی کلائی پکڑی تھی، وہ سوچتی رہی سوچتی رہی اور اسی
طرح نہ جانے کتنے ہفتے گزر گئے، اور پھر ایک صبح اس نے ارادہ کرلیا
کہ آج وہ محمود سے ملنے ضرور جائے گی، جس نے اس کی جان بچائی، جس نے
اسے تڑپنا سکھادیا، وہ سب کچھ رک رک کر اس سے کہہ دے گی، کہ وہ کیوں
اس کی دنیا میں آبسا، وہ تو خودکشی کرنے جارہی تھی، وہاں سے ایک دم دولے آئی
ایسا کیوں ہو گیا اور پھر وہ سوچتی کیا ہو گیا، اور وہ کچھ سوچ کر جھینپ جاتی
وہ دو ماہ سے تڑپ رہی تھی ۔۔۔ اور آخر کار ۔۔۔ اب وہ
خود اس کے پاس جارہی تھی ۔۔۔ ہوسپٹل پہنچ کر اس نے نرس سے
ڈاکٹر محمود کے لئے دریافت کیا۔
نرس نے بتلایا کہ وہ آپریشن روم میں ہیں۔

وہ بیقراری سے بنچ پر بیٹھ گئی، جہاں اور بہت سے مریض ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے، نہ جانے کتنی دیر یونہی بیقراری میں گزر گئی ـــــ کہ یکا یک اس نے دیکھا وہ سامنے سے آرہا تھا، اس کے ساتھ دو جوان نرس تھیں ہنستا ہوا، وہ ذرا جھک کر پیچھے ہو گئی، میز کے قریب آکر وہ مریضوں کا حال پوچھنے لگا، وہ اس کو تکتی رہی نہ جانے کتنی دیر گزر گئی، آخر اس کا نمبر آیا۔

اب صرف دو مریض اور رہ گئے تھے، وہ مسکرائی، ڈاکٹر نے اس کو پہچانا بھی نہیں، بلکہ اس نے بالکل ایک ڈاکٹر کی طرح سے پوچھا،
کیا شکایت ہے تم کو؟

زیب کا دل چاہا، وہ کہہ دے میں زیب ہوں، آپ کو یاد ہے، اس رات جب میں خودکشی کرنے جارہی تھی، آپ نے میری جان بچائی تھی، آپ ہی نے تو مجھے سہارا دیا تھا، اور آپ ہی کے سہارے پر میں جی رہی ہوں، یاد آیا آپ کو، میں زیب ہوں زیب، اب آپ کی یاد ہی میری زندگی ہے۔
مگر وہ ایک لفظ نہ بول سکی، جیسے اس کی زبان بند ہو گئی تھی۔

"ارے" میں پوچھ رہا ہوں کیا بیماری ہے تمہیں" اس نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

"بخار آتا ہے" وہ گھبرا کر کہہ گئی۔

"اور؟"

"منہ سے خون آتا ہے" وہ جھنجھلا کر بولی

"کب سے؟"

"دو مہینے سے" وہ جانے کے لئے راستہ ڈھونڈھ رہی تھی، اس کا دل چاہتا تھا، وہ ایک چیخ مار کر ہوسپٹل کی چہار دیواری سے باہر نکل جائے۔

T. B. ، ڈاکٹر نے مرض تجویز کیا ، اگر اس دوا سے فائدہ نہ ہو تو تم کو ہوسپٹل میں رہنا پڑے گا۔ نسخہ اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی

دوسرے روز صبح ایک عورت کی لاش دریا کے کنارے پڑی تھی۔

زندگی ایک جوا ہے، کوئی ہارتا ہے کوئی جیت جاتا ہے" اس نے کتاب کے ورق کو آہستہ سے پلٹ دیا۔ اس کی نگاہیں کتاب سے ہٹ کر کمرے کے ایک کونے کو تکنے لگیں اور اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کونے میں اس کا ماضی مسکرا رہا تھا ــــ ایک پھیکی سی افسردہ مسکراہٹ،

اس کی زندگی کا پہلا ورق، ــــ اور وہ کبھی بھول نہ سکی اس واقعہ کو ــــ گرمیوں کی ایک شام تھی، وہ بڑے آرام سے گھاس پر بیٹھی ہوئی کوئی گیت گنگنا رہی تھی، آپا بڑے تکلف سے سیڑھیوں پر سے اتریں اور اس کے ساتھ وہ تھا، سفید قمیص پہنے جس کے دو بٹن کھلے تھے، سفید پتلون، ہاتھ میں ۵۵۵ کا ٹین، بالوں کا ایک گچھا جو کسی قدر خمدار تھا اس کی پیشانی پر بکھر آیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

یہ ہے میری چھوٹی بہن ناز، " تھرڈ ایر میں پڑھتی ہے " آپا نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا "اور آپ ہیں کزن نشاط" اس نے مسکرا کر سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا، اس کی نگاہیں کس قدر شریر تھیں، ہلکی نیلی نیلی تیز نگاہیں، وہ مسکرا تا رہا، درختوں کی چھاؤں میں وہ کتنا دل کش نظر آرہا تھا، جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے اپنے فن کا بہترین کمال پتھر میں تراش کر رکھ دیا ہو، وہ تینوں مختلف عنوان پر باتیں کرتے رہے جانے سے پہلے اس نے بڑی پیاری نگاہوں سے ناز کو دیکھا، اس کے دیکھنے میں

اس قدر گہرا دکھ تھا، اتنی چاہت تھی، اس قدر پیار تھا، جیسے وہ برسوں سے اس کو جانتا تھا
جیسے اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں اب ہم پھر کب ملیں گے،، اور ناز نے گھبرا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں
جیسے وہ کچھ ڈھونڈھ رہی ہو جو ابھی ابھی کھو گیا تھا، اس کے جانے کے بعد وہ کچھ بےچین
سی آ کر گھاس پر بیٹھ گئی، سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے کچھ دیر پہلے، لیکن نہ جانے کیوں وہ
خاموش ہو گئی تھی، دوسرے روز آپا فاروقی نے بتلایا، نشاط نے ان دونوں کو شام
کی چائے پر بلایا ہے، اور اس کا دل دھڑکنے لگا، وہ گھنٹوں کپڑوں کی الماری کے
پاس کھڑی سوچتی رہی کہ آج شام کو وہ کون سی ساری پہنے، اس نے ہر ساری کو آئینہ
کے سامنے اپنے اوپر رکھ کر دیکھا اور پھر رکھ دیا، بڑی دیر کے بعد اس نے سیاہ چولی اور
سفید شفون کی ساری پہنی جس کی آنچل پر ستاروں کا ایک پھول بنا تھا، کپڑے
پہن کر کمرے سے نکلی تو آپا نے سویٹ پی کے پھول اس کے بکھرے ہوئے بالوں میں لگا دیے۔
جیسے ہی کار پورٹیکو میں پہنچی، نشاط ورانڈے میں اس کا انتظار کر رہا تھا — خدایا
وہ نیلی نگاہیں، کس میں ہمت تھی جو ان کی تاب لاتا، اس کی باتوں کا انداز اتنا پیارا
اور پرکشش تھا جیسے دور کہیں کوئی رباب کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو، چائے کے بعد آپا
رؤفی کے اصرار پر اس نے پیانو پر دو غزلیں گائیں، گاتے وقت وہ کس قدر حسین معلوم
ہو رہا تھا، لمبی لمبی سفید انگلیاں پیانو پر اس تیزی سے چل رہی تھیں کہ وہ دیکھتی رہ گئی
گانے کے بعد نشاط نے ناز سے گانے کی فرمائش کی وہ نہیں نہیں کرتی رہی لیکن جب
نشاط نے اس سے بےحد اصرار کیا اور آپا رؤفی نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ مجبور ہو گئی

ـــــ وہ پیانو بجا تا رہا اور اس نے ہلکی سروں میں گایا۔

تیرے در سے ہم اشک بار آئے　　دل کو تھامے جگر فگار آئے

ایسی آنکھیں غضب کی ہوتی ہیں　　دیکھنے سے جسے خمار آئے

نشاط نے ایک بارگی نازکو دیکھا ـــ اور وہ مسکرا دی۔

جس سے سرسبز ہو مرا گلشن　　بن کے کوئی وہی بہار آئے

غزل کے اختتام پر نشاط نے تعریف کے پل باندھ دیے

دہلی جانے سے پہلے اس نے ناز کو عمر خیام اور ٹیگور کی نظموں کا مجموعہ دیا۔

جس کے پہلے صفحے پر اس نے لکھا تھا۔ HOPING YOU WILL NOT FORGET

یہ ہلکے ہلکے اشارے اس کی نگاہوں کا پیام ـــــ گہری گہری سانسیں ناز کو پاگل بنائے دے رہی تھیں ـــــ اس کی خوشی، اس کی مسکراہٹ آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں آگئی ـــــ ہائے اللہ، ہائے اللہ یہ سب کیا ہوا جا رہا ہے،،

دن گزرتے گئے وہ اس کو بڑے دلچسپ خط لکھتا، بڑے پیارے خط، وہ گھنٹوں ان کو بار بار پڑھتی، ایک خط میں اس نے لکھا تھا،

"ناز میں کتنا بد نصیب انسان ہوں، جس کو قسمت تم سے دور کر رہی ہے گورنمنٹ مجھے انگلینڈ بھیج رہی ہے، خدا جانے اب میں تم سے کب ملوں، یہ میری بد نصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ میں جتنی بار تم سے ملا، آپا رضوی تمہارے ساتھ تھیں، میں تم سے کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے کتنا ارمان تھا، کہ کبھی تم مجھے

تنہا ملتیں، میں چپکے سے تمھارے دل کی دھڑکنیں سنتا، تمھارے بالوں کی خوشبو سونگھتا، بڑی پیاری خوشبو آتی ہے تمھاری زلفوں سے، میرے دہلی جانے سے پہلے تم میرے یہاں آئی تھیں، یاد ہے، تمھارے بالوں میں پھول لگے تھے، وہ تمھارے بالوں میں پھول لگے تھے وہ تمھارے بالوں سے گر کر صوفے پر گر گئے تھے وہ پھول میرے پاس اب تک محفوظ ہیں، ان میں سے ایسی ہی خوشبو آتی ہے، سونے سے پہلے ان پھولوں کو بہت دیر تک سونگھا کرتا ہوں، اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تمھارے بال میرے چہرے پر بکھر آئے ہیں اور تمھارا سر میرے تکیہ پر رکھا ہے، تمھاری گرم گرم سانس میرے ہونٹوں سے چھو جاتی ہے ـــ ناز: اب ہم کب ملیں گے؟ خدا ہم کو جلد ملائے۔

اور ناز اس خط کو لے لے کتنی بار رو دی تھی کہ اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں کچھ روز بعد آپا روفی مع ناز کے شکار پر چلی گئیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ ہفتہ شہر کے باہر گزاریں گی ـــ ان کی شوٹنگ پارٹی میں بہت سے لوگ شریک تھے مگر ناز سب سے بیگانہ کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ آپا روفی اور ان کے مہمان جنگل میں شیر کے شکار کے لئے چلے گئے۔ اور وہ خیموں میں نوکروں کے ساتھ رہ گئی۔ آپا روفی کے بعد اصرار پر بھی وہ ان کے ساتھ نہیں گئی۔ اکثر صبح وہ نیلے رنگ کا اسلیک اور فلینل کی سفید قمیص پہنے جھیل کے کنارے گھنٹوں بیٹھی رہتی سورج نکلنے سے پہلے بطخیں غول کے غول میں آکر جھیل پر کالی گھٹاؤں کی طرح

چھا جاتیں اور وہ ان کے پیار کو گہری نگاہوں سے دیکھا کرتی، کس قدر محبت کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے پروں کو کریدا کرتی تھیں، چونچ سے چونچ ملا کر بیٹھتی تھیں کچھ دیہاتی لڑکوں نے ایک سرخاب پکڑی اور اس کا ساتھی کس بیتابی سے چیخ رہا تھا۔ بار بار جھیل کے کنارے پر اڑتا ہوا آتا اور زور زور سے چیختا، ناز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

خدایا! انسان کے دل میں تو نے ایسی محبت کیوں نہیں دی؟ اس کا دل سخت کیوں کر دیا میرے اللہ؟ اور اس نے اس سرخاب کو افق کی طرف اڑا دیا۔ اس نے سنا تھا، اگر سرخاب کا ساتھی مر جائے تو دوسرا چیخ چیخ کر اپنی جان دیدیتا ہے۔ اور پھر اس نے دیکھا فضا میں اس کا ساتھی پہنچ کر اس سے آملا۔ اور وہ دونوں ایک ساتھ پرواز کر گئے، نیلے آسمان کے سائے میں ـــــ وہ مسکرا دی، کاش اس کا ساتھی بھی اس سے آملے ـــ کاش!! اور اس کی آواز بھرا کر رہ گئی، اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ بلند ہوئے اور نیچے آرہے۔

چار ہفتے بعد وہ سب لوگ شوٹنگ پر سے واپس آگئے، نشاط کا خط ناز کی آمد کا منتظر تھا ـــــ گہرے نیلے رنگ کا لفافہ ـــ جو اس نے کیپ ٹاؤن سے لکھا تھا اور پھر خط پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے ہونٹ کس کر دانتوں سے دبا لیا اور ٹپ ٹپ کر کے کچھ موٹے موٹے آنسو خط پر گر پڑے لکھا تھا

"میں تمھیں کیسے سمجھاؤں، یہ سب کیسے ہو گیا۔۔۔ میں جانتا ہوں تمھیں اس خط کے ملنے سے کتنی تکلیف ہو گی، لیکن میں تمھیں دھوکا نہیں دے سکتا ۔۔۔ میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے، جو تمھاری طرح خوبصورت ہے، اس کے بالوں کا رنگ تمھارے بالوں سے ملتا جلتا ہے ۔۔۔ اس کی قربت میں تم اکثر یاد آ جاتی ہو، ناراض نہ ہونا، میں تمھارے بالوں کے پھول واپس کر رہا ہوں ان کو تم اپنے ہی ہاتھوں سے پھینک دینا۔۔۔ کبھی کبھی اپنی خیریت لکھ دیا کرنا۔۔۔

اور وہ مرجھائے ہوئے پھول اس کے سامنے پڑے تھے ۔۔۔۔۔۔
اس نے بہت آہستگی سے ان کو اٹھایا اور جلتے جلتے آنسو ان پر گر پڑے اس کے کانپتے ہوئے ہونٹ جھکتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مرجھائی ہوئی پتیاں اس کے ہونٹوں سے چھو گئیں اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ جیسے وہ صبح صبح نشاط سے مل گئی ہو۔۔۔

گناہوں کے سائے میں

رات کو جب میں "BATHING BEAUTY" فلم دیکھ کر واپس آیا تو مجھے بڑی دیر کے بعد نیند آئی ـــــ لحاف میں منہ چھپا کر مجھے محسوس ہوا جیسے بہت سی جوان خوبصورت لڑکیاں میرے ریشمی لحاف کے اندر لیٹی ہوں، خوبصورت سڈول جسم والی لڑکیاں ـــــ جن کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو میرے دماغ میں گھسی جا رہی ہے اور ان کے جوان جسم کی گرمی! توبہ ہے! رات گئے تک میں کروٹیں بدلتا رہا۔ سگرٹ پیتا رہا۔ سگرٹ کے نیلگوں دھوئیں میں انگڑائیاں لیتی ہوئی لڑکیوں کی پرچھائیاں دیکھتا رہا، نہ جانے کب نیند آئی، یہ مجھے نہیں معلوم!

میرے مکان کے سامنے ایک سکھ فیملی رہتی ہے، پہلے مکان میں جس کے کمرے کے دروازے پرسے ورانڈے کے سامنے کھلتے ہیں۔ میں صبح کے وقت اپنے ورانڈے میں ہلکی ہلکی نیم گرم دھوپ میں بیٹھ کر شیف کرتا ہوں، میں نے اکثر ایک خوبصورت لڑکی کی پرچھائیں اسی کمرے میں دیکھی ہے۔ جو صبح آئینہ کے سامنے اپنے بال سنوارا کرتی ہے۔ مختلف طریقوں سے اور میں بار بار اس مکان اس کمرے اور اس پرچھائیں کو گھورا کرتا ہوں، کس قدر حسین ہے یہ لڑکی! جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے اپنے کمال کا بہترین نمونہ

پتھروں میں تراش کر رکھ دیا ہو ـــــ میرا زیادہ تر وقت اسی دروازے میں گزرتا ہے، وہ زیادہ تر اسی کمرے میں رہتی ہے اور کمرے کے دروازے کا سہارا لے کر بڑی دیر تک کھڑی رہتی ہے۔ اس کے ہنسنے کا اتار چڑھاؤ کس قدر تبسم انگیز ہے۔ وہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ سے مسکراتی ہے اور اس کی شوخ نگاہیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہیں "تم حسین تو بہت ہو مگر بزدل بھی بہت ہو۔ آؤ ۔ ذرا ہمت سے کام لو اور مجھے اپنی آغوش میں لے لو، کیا میرے شباب سے تم متاثر نہیں ہوئے ـــــ ذرا آگے بڑھو ـــــ اس طرح گھورنے سے کیا فائدہ" ـــــ اور میں بیتاب ہو کر ذرا آگے بڑھا، وہ اسی طرح کھڑی مسکراتی رہی جیسے کہہ رہی ہو "شاباش کا مریڈ" میں نے اس کو ایک بیحد رومانٹک خط لکھا، شیلے کی ایک بیحد پیاری سی نظم بھی کوٹ کی اور وہ خط اس کے کمرہ میں پھینک دیا ـــــ میں نے دیکھا وہ اٹھاتی ہوئی گئی اور مسکرا کر وہ خط اپنے بلاؤز میں رکھ لیا اور پھر اندر بھاگ گئی، اسی دن اس نے مجھے ایک نیلے لفافے میں خط بھیجا تھا، کتنی خوشبو تھی اس کاغذ کے ٹکڑے میں ـــــ میں بڑی دیر تک اس کو اپنے ہونٹوں سے لگائے رہا ـــــ اس نے مجھے بلایا تھا اور رات کو میں اس سے ملنے گیا تھا ـــــ وہ سیاہ شفون کی ساری پہنے تھی۔ جس پر سامنے گلاب کا ایک بہت بڑا سا پھول بنا ہوا تھا ـــــ سرخ چولی اور سرخ کوٹ جو اس کے شانوں پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے بتلایا کہ اس کا نام روزی ہے

وہ اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہے، جو اس پر بری طرح جان دیتا ہے، محض اس لئے کہ وہ بالکل غیر رومانٹک انسان ہے، نہ اس کی باتوں میں شیرینی ہے نہ پیار میں گرمی ــــ بس وہ ایک مرد ہے بد وضع انسان عورت اور حسن کا بھوکا ــــ روزی کو اس کے بالوں سے نفرت ہے ــــ ہر طرف بالوں کا جال ــــ الجھاوا اور اس کا چہرہ قریب آتے ہی اس کو چھینکیں آجاتی ہیں ــــ ایک، دو، تین، چار ــــ

اس رات میں دیر تک روزی کے بارے میں سوچتا رہا ــــ روزی ایک عورت ہے اور ایک بیوی ــــ وہ چھپ چھپ کر ایک غیر سے عشق کرتی ہے، مگر آزادی کے ساتھ، دنیا والوں سے نہیں کہہ سکتی مجھے اپنے شوہر سے نفرت ہے، اس کی قربت میں میرا دل نہیں دھڑکتا، کیونکہ وہ بیحد بدشکل انسان ہے ــ اس کے پیار سے مجھے چھینکیں آجاتی ہیں اس کی ہر چیز سے مجھے گھن آتی ہے، اس کی بڑی توند دیکھ کر میرے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں، اور میں سوچتا ہوں کہ یہ عورت کی زبردست کمزوری ہے کہ وہ دنیا سے ڈرتی ہے۔ وہ چھپ کر عشق تو کر سکتی ہے، مگر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی ــ شاید روزی کو اپنے شوہر کے عہدے سے عشق ہے، وہ کمشنر کی بیوی ہے، بڑے سے گھر کی مالکہ ہے۔ جس کی ہر شے قیمتی ہے، اس کے پاس ۱۹۴۹ء کی بیوک ہے، جس پر

بیٹھ کر وہ گھومنے جاتی ہے ، اور کبھی کبھی عشق کر لیتی ہے ، ولایت اور ہندوستان میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ وہاں آزادی کے ساتھ عشق کیا جاتا ہے اور یہاں چوری چوری ۔

۲

پچھلے ہفتہ سے میرا ایک دوست احمد مع اپنی بہن زیبا کے میرا مہمان ہے اس کی بہن مجھ سے پردہ کرتی ہے ، جس روز احمد میرے یہاں آیا تھا اس دن میں نے زیبا کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی ۔ سیاہ جالی کی نقاب میں وہ بالکل گلاب کی کلی طرح معصوم دکھائی دے رہی تھی اور میں دل تھام کر رہ گیا

میں اپنے کمرہ میں لیٹا اس کی آواز سنا کرتا ہوں ، وہ اکثر فارسی کی غزل گنگنایا کرتی ہے ، پرسوں احمد کہیں باہر گیا ہوا تھا ، زیبا اپنے کمرے میں اکیلی تھی اور مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ، میں جرات کر کے اس کے کمرے میں چلا گیا ۔ وہ اس وقت بھی صوفے پر لیٹی کوئی شعر گنگنا رہی تھی ، مجھے اچانک دیکھ کر اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ——— اور میں مسکرا دیا ۔ وہ ڈر کر کونے میں سرک گئی اور میں آگے بڑھ گیا ، اس نے جلدی سے

اپنے بالوں کو ڈوپٹہ میں چھپالیا، میں نے دیکھا۔ اس کے بالوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا، میرا دل دھڑکنے لگا،

"گھبرا کیوں گئیں؟"

"آپ یہاں کیوں آئے؟ میں پردہ کرتی ہوں۔ بھیا باہر گئے ہوئے ہیں، جب وہ آئیں گے تب آپ آئیے گا، اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی،

"لیکن میں تو تم سے ملنے آیا ہوں، بھیا کے پاس نہیں، میں نے دیکھا وہ اور زیادہ گھبرا گئی۔

خدا کے لئے یہاں سے چلے جائیے، میں آپ سے منت کرتی ہوں، وہ اپنا منہ چھپا کر رونے لگی، میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے، وہ بری طرح کانپ رہی تھی "زیبا تم حسن سے زیادہ معصوم ہو اور حسن تم سے زیادہ" اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تراخ سے میرے منہ میں تھپڑ مار دیا۔ وہ غصہ میں اور زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی اور میری گرفت میں اس طرح تڑپ رہی تھی، جیسے پانی کے باہر مچھلی تڑپتی ہے، مجھے اس پہ اور پیار آگیا اور وہ جھجکتی رہی، میں اس کے قریب ہوتا گیا، بیحد قریب!

آج مہینہ بھر کے بعد احمد اپنے وطن واپس جا رہا ہے ــــــ احمد بار بار میری محبت و مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر رہا ہے اور زیبا مایوس نگاہوں سے زمین گھور رہی ہے، بیحد اداس اور شرمندہ سی، وہ اپنے

بھائی سے میری شکایت بھی نہیں کر سکتی کہ تمھارے دوست نے اپنے گناہوں کا
بوجھ میرے پیٹ پر باندھ دیا۔ وہ خاموشی سے چلی گئی۔ اپنے قسمت کے
لکھے کو وہ اور اس کے آنسو نہ مٹا سکے۔

۳

میں جب بہت پریشان ہوتا ہوں تو پائپ پر پائپ پیتا ہوں، غم بھلانے
کے لیے شراب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، پریشانی میں میں اکثر پیچھے باغ میں
ٹہلتا ہوں، جہاں میرا مالی اور اس کی بیوی درختوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں
جب میں ٹہل رہا تھا تو مالی مہندی کی روش برابر کر رہا تھا اور اس کی بیوی ذرا
فاصلہ پر بیٹھی پھوس کاٹ رہی تھی، جیسے ہی میں پاس سے گزرا وہ مسکرائی،
میں چونک پڑا، میں نے مڑ کر دیکھا، وہ حسین تو نہ تھی، مگر بدشکل بھی نہیں
کہی جا سکتی تھی، گہرا سونلا رنگ، چمکتی ہوئی چھوٹی گھنی تیز نگاہیں، چھوٹی سی
پیلی چولی میں سے اس کا سینہ باہر نکلا آرہا تھا۔ میں قریب آگیا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"چمپی" وہ اٹھلائی

"کب شادی ہوئی تھی تیری؟"

پچھلے برس، وہ لچک کر بولی، میں نے دیکھا جب میں چھمی سے باتیں کر رہا تھا، اس وقت مالی پھاٹک کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اور موقع مل گیا۔ مگر مجھے تعجب ضرور تھا کہ میرے نوکر میری زندگی کا ایک رومانس جانتے ہیں ۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ عورت اور شراب یہ ہی میری زبردست کمزوری ہے پھر یہ مالی اپنی بیوی کو تنہا چھوڑ کر کیوں چلا گیا ـــــ اتنے میں وہ بولی۔

بابو جی، آج میں آپ کے کمرے میں پھول لگا دوں"

"ضرور" میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ پازیب کی آواز کے ساتھ اس کی کمر لچک رہی تھی۔ میں سوچنے لگا، کتنی چھوٹی سی کمر ہے اس کی۔

وہ پھول شرارت سے گلدان میں پھول لگانے لگی۔ اور میں اس کے جوانی کے بناؤ کو دیکھتا رہا۔

بغیر کسی حیل و حجت کے وہ رات بھر میرے کمرے میں رہی، وہ اٹھلاتی رہی، نخرے کرتی رہی اور میں اس کی خوشامد کرتا رہا۔

صبح سویرے جب میں سو کر اٹھا تو وہ میرے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی، پھٹی ہوئی کرتی میں سے وہ ننگی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سوتے میں اس کو پیار کر لیا وہ کسمسانے لگی۔

اری اٹھ، دیکھ صبح ہو گئی، جا گھر جا،" اس نے لیٹے لیٹے سی انگڑائیاں

پھر شام ہونے لگی۔
کھجور کے لمبے لمبے درختوں کی آڑ سے سورج کی گلابی روشنی بکھر کر آ گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی یاسمین کی کلیوں کو اپنے آنچل میں سمیٹنے لگی، کتنی خوبصورت تھیں وہ کلیاں۔ اس نے زور سے سیٹی بجائی ٹا ٹڑا لا را ٹا ٹڑا لا را۔
دوسری جھاڑی میں سے آمنہ نے منہ نکالا۔ "تاٹڑا لا را" اس نے مڑ کر دیکھا
"ہوما ئی کڈ"
"ہائے یہ کلیاں" اس نے گہری سانس لی
" روکیوں دیں؟
ویسے ہی"
پسند ہیں یہ کلیاں"
"ہوں"
"دل چاہتا ہے، ان کلیوں کا ہار بنا کر بالوں میں لگا کر مر جائیں
"کیوں؟
"آج ہم بہت اداس ہیں ــــ یہ شام ــــ یہ شام کتنی رونٹک ہے۔
بس ایسی ہی ایک شام کو یاسمین کی کلیاں بالوں میں لگا کر مر جائیں، تم رو گی آمنہ

" نہیں رونے سے تو تم زندہ ہو نہیں جاؤ گی" پھر فائدہ ہی کیا ـــــ
" ہائے آمنہ، سچ سچ تو کتنی سنگ دل ہے، اپنی بہن کی لاش پر نہیں روئیگی؟
" میرے اکیلے نہ رونے سے کیا کمی ہو جائے گی تم کو بہت سے لوگ روئیں گے
امی، ابا، جمال، جمال کے دوست اور بہت سے وغیرہ وغیرہ قسم کے لوگ"
ہائے آمنہ"
" رخشی" دور سے امی کی آواز آئی اور وہ جلدی سے بھاگی۔
جی امی، وہ دھم سے دیوان پر گر گئی
" اچھی بیٹیاں شام کو درختوں کے نیچے نہیں جاتیں اور اس کو ایک دم سے
چھینک آ گئی
" دیکھا نزلہ ہو گیا، جاؤ اپنے کمرے میں جا کر پڑھو، اور جیسے ہی وہ اپنی
جان بچا کر بھاگنا چاہتی تھی یاسمین کی کلیاں اس کے آنچل سے کھل کر فرش پر آ گریں
" رخشی تم نے پھر کلیاں توڑیں، کئی بار منع کر چکی ہوں، کنواری لڑکیاں پھول
نہیں پہنتیں، لاؤ ادھر لاؤ، اور اس نے دبی زبان سے کہا
" امی ـــــ آج حرج آج پہن لوں"
" نہیں اور انھوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے کلیاں مسل کر صحن میں
پھینک دیں، تم لڑکیوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے، کبھی ہم بھی جوان تھے مگر تم
جیسی لڑکیوں کی طرح ہمارے طریقے نہ تھے نہ سر پہ آنچل، نہ شرمیلا پن،

آنکھوں کا پانی مر گیا ہے ہر وقت چہلیں، کبھی تو سنجیدہ ہو کر بیٹھا کرو"
اس کی آنکھیں بھر آئیں وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی، صوفے پر آمنہ لیٹی ہارڈی کی ناول پڑھ رہی تھی، اس نے زور سے کشن اس کے سر پہ دے مارا

"رخشی خیریت تو" اور وہ رو دی،
رخشی تمھیں میری قسم کیا ہوا"
"امی نے ڈانٹا، صبح سے شام تک ڈانٹیں پڑا کرتی ہیں، یا اللہ میں مر کیوں نہیں جاتی؟
رخشی، ہٹاؤ بھی اس ذکر کو، آؤ کچھ اور باتیں کریں، کل کی پکچر کتنی اچھی تھی"

"ہوں"
اور خاص کر وہ آخری سین، جب ہیرو ہیروئن کو وہ پہاڑی دکھلاتا ہے جہاں وہ ملا کرتے تھے اور اس پہاڑی کو دیکھتے دیکھتے وہ اس کی آغوش میں مر جاتی ہے۔ ہائے!

"ہوں" اور آمنہ نے تپ کر کتاب رخشی کے سر پہ پٹخ دی ——————
"یو سلی گرل"

ہلو" دروازے پر جمال کھڑا تھا، آجاؤں؟ اور جیسے ان دونوں کو ہوش آگیا ہو سینٹ کی خوشبو ان دونوں کے دماغ میں گھس گئی
"بہ شوق" رخشی نے اپنی لال لال ناک پر پوڈر لگاتے ہوئے کہا
یہ تم دونوں پہ آج ویرانی کیسی؟

" امی نے رخشی کو ڈانٹا ہے ۔
رخشی، ڈارلنگ ، جمال اس کے قریب آگیا اور آمنہ نے اپنا منہ پھیر لیا وہ رخشی کو عجیب عجیب ناموں سے پکارتا تھا ، کبھی ڈبے بی، کبھی مائی لو، کبھی سوئٹی اور اس کو آمنہ ، صرف آمنہ ـــــ گویا اس کے دل ہی نہ تھا ، وہ پتھر کی بنی ہوئی تھی، کبھی تو کہہ دیتا آمنہ تم بھی ایک دلکش لڑکی ہو مگر توبہ ـــــ اور وہ تپ کر ناول کے ورق الٹنے لگتی ـــــ میں نے دیکھا وہ دونوں اٹھ کر گیلری میں چلے گئے ہنستے ہوئے ۔ جب وہ واپس آئے تو ویسی ہی صوفے پر لیٹی ہوئی تھی ، "آمنہ میری گڈو جا ، جلدی سے جمال کے لئے آئس کریم لے آ
" تمہارا سر، وہ جل کر بولی، میری جائے بلا
" میری جان " وہ اس کی خوشامد کرنے لگی ،
" نہیں ، ہم تو نہیں جائیں گے ،
" تجھے ہماری قسم آمنہ جا، لپک کر جا ، دیکھ جمال انتظار کر رہے ہیں "۔
وہ عاجزی سے بڑبڑاتی ہوئی اٹھی ، رفریجیریٹر کے پاس پہنچ کر اس کا دل چاہا، وہ اس کے اندر گھس کر بیٹھ جائے اور آئس کریم کی طرح برف بن جائے ٹھنڈی ٹھنڈی سی ، اس کا جسم کتنا جل رہا تھا ، جیسے اس کو بخار ہو گیا ہو اس نے کپ میں آئس کریم نکالی ،
" آمنہ " امی کی آواز آئی ،

"جی آئی ابھی،
"کیا کر رہی ہو،
"جی، جی یہ آئس کریم،
کس کے لئے لئے جا رہی ہو ؟" انھوں نے وہیں سے پوچھا"
"رخشی نے مانگی ہے"
"نہیں رخشی کو نزلہ ہے، وہ آئس کریم نہیں کھائے گی۔"
"جی، اور آمنہ اکڑتی ہوئی چلی گئی،
"میری گڈو، لائی آئس کریم،
"نہیں، امی کی اجازت نہیں، وہ تن کر بولی، وہ اپنے دل میں خوش تھی کہ کہ اس نے رخشی سے بدلہ لے لیا، اس نے آہستہ سے سیٹی بجائی، ٹھاڑ الارا، اور رخشی بڑے رومنٹک اسٹائل سے اپنی ساری سنبھالتی اٹھی:
چڑیل کہیں کی، ذرا سا کام نہیں ہوتا تجھ سے، تھوڑی دیر بعد وہ آئس کریم لئے جمال کے سامنے بیٹھی تھی۔
"تھوڑی سی اور لو نا بی، اسے اگڈ بوائے، وہ چمچے بھر بھر کر آئس کریم کھا رہا تھا — وہ تپ کر باہر چلی گئی۔
"امی، اس نے بڑے رازدارانہ طریقے سے امی کو مخاطب کیا،
"کیا ہے،

وہ آپ نے منع کیا تھا کہ رخشی آئس کریم نہیں کھائے، اب ذرا جا کر دیکھئے وہ لاٹ صاحب بھی نوش فرما رہے ہیں جمال، بس ذرا سا موقع ملا نازل ہو گئے جیسے ان کے گھر ہی نہیں ہے اور رخشی سے اس طرح چھپکے چھپکے باتیں فرماتے ہیں جیسے وہ ان کی جائداد ہے، کمبخت کہیں کا، مجھے تو صورت سے نفرت ہے"

رخشی کہاں ہے؟ وہ غصہ میں بولیں"

"جی اپنے کمرے میں، وہ تیزی سے رخشی کی کمرے کی طرف بڑھیں،

"رخشی" کمرے میں سے کھسر پھسر باتوں کی آواز آئی اور پھر پلیٹ گر نیکی اور اتنی دیر میں امی وہاں موجود تھیں، انھوں نے اتنے زور سے انھیں ڈانٹ بتائی کہ وہ کانپ گئی۔

دوسرے روز سے جمال سے ملنا بند ہو گیا، باغ میں گھومنے کی ممانعت، آئس کریم کھانا بند، رخشی۔۔۔ رخشی بیچاری۔۔۔ مگر آمنہ خوش تھی۔ اگر وہ کسی سے مسکرا کر بات نہیں کر سکتی تو رخشی کو بھی کوئی حق نہ تھا کہ گھنٹوں چھپکے چھپکے جمال سے کھسر پھسر کرتی رہے۔ اٹھلا اٹھلا کر اس سے باتیں کرے وہ مناتا رہے اور وہ منتی جائے، وہ نخرے کرے اور وہ خوشامد کرتا رہے، اب ان باتوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ رخشی اپنے کمرے میں پڑی رہتی اور جمال صرف امی کے پاس آتا تھا، رخشی کے کمرے میں نہیں۔

بہت دنوں تک وہ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہے جیسے

ایک دوسرے کو پہچانتی ہی نہیں، یوں ہی بہت سی غیر دلچسپ سی شامیں گزر گئیں۔
بے کیف سے دن ——————— کوئی دس دن کے بعد

اس کے کمرے کے پردوں کو ایک ہلکی سی جنبش ہوئی

"رخشی" وہ غسل کرنے جا رہی تھی، اس نے ایکبارگی نگاہیں اوپر اٹھائیں،

"آؤ دوستی کریں،" وہ خاموش کھڑی رہی۔

"رخشی،" اور اس کے آنسو ڈھلک کر گالوں پہ آ رہے۔

"ہم کیوں لڑے تھے، کتنے بے کیف دن گزر گئے،" اور رخشی کا دل چاہا، اپنی
بہن کو کلیجے کے اندر چھپا لے ——— اتنا روئے اتنا روئے کہ آنکھوں میں آنسو

کا ایک قطرہ نہ رہے "آمنہ میری جان"

پھر اس سے بہت آہستگی سے پوچھا

"جمال آیا ہے؟"

"ہاں، مگر پھر بھی،"

"کب آیا تھا"

پرسوں"

میرا کوئی ذکر ہوا تھا"

ہاں"

کیا؟"

جمال امی سے کہہ رہے کہ وہ رخشی کو معاف کر دیں اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں بلکہ
وہ خود یہاں کا آنا کم کر دیں گے

"پھر امی نے کیا کہا؟

وہ بولیں، رخشی ضدی ہے اور کچھ نہیں، اور تمہارے یہاں آنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا

وہ خاموشی سے سنتی رہی ـــ آمنہ اب کب جمال آئے گا

"معلوم نہیں" وہ بغیر کچھ کہے غسل کرنے چلی گئی ـــ رات کو ـــ وہ یونہی
آمنہ کے کمرے میں چلی گئی، ـــ آمنہ سو رہی تھی وہ اس کے پلنگ کے قریب ہی بیٹھ گئی
بلا کسی ارادہ کے ـــ تکیہ کے نیچے ایک تصویر کا کونہ نکلا ہوا تھا ـــ اس نے یوں
ہی نکال لیا اور تصویر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آنسو چھلک آئے تصویر کے نیچے
ایک کونے پہ لکھا ہوا تھا

"جمال کی طرف سے رخشی کو"

اور کچھ دیر کیلئے رخشی کا دماغ کچھ نہ سوچ سکا کہ آمنہ کو جمال سے نفرت کے باوجود بھی اتنی
دلچسپی ہے کہ رات کو سونے سے پہلے وہ اسکی تصویر دیکھا کرتی ہے اور اتنی نفرت کے ہوتے
ہوئے وہ رخشی کے البم میں سے جمال کی تصویر چرا لائی ـــ آخر کیوں؟ ـــ آخر کیوں
کیا اسکو بھی جمال سے لگاؤ ہے، کیا وہ بھی جمال کی محبت میں اسی طرح جل رہی ہے جس طرح
وہ جل رہی ہے جو اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی ـــ رخشی، آمنہ اور جمال جیسے
تینوں نام مل جلکر ایک حرف بن گئے ہوں "محبت" اور پھر اونچے آسمان پہ ایک ملکوتی نغمہ
بن بہا اور وہ وہ خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگی، جیسے خوشیوں کا آخری گیت بھی ختم ہو گیا ہو۔

نیند

آج اس کو نیند نہیں آرہی تھی اور وہ گھڑی گھڑی اپنے ناخنوں سے جسم کو
کھجاتی، اور جب اسکے ملائم جسم میں ناخن چبھنے لگتے تو وہ آہستہ آہستہ سہلانے لگتی
نہ جانے کیا ہوگیا تھا، بس یوں ہی وہ کروٹیں بدل رہی تھی، دوسرے
پلنگ پہ قریب لیٹے ہوئے ارشد نے کھنکھارا اور وہ ذرا چونک سی گئی
اور فوراً ہی کروٹ لینے کے بہانے سے آہستہ آہستہ کھانسنے لگی۔ وہ خاموش
لیٹا ہوا تھا، شاید اس کو نیند بہت زوروں کی آرہی تھی، مگر غزالہ کی تو
نیند نہ جانے کب کی غائب ہو چکی تھی اور بڑی بڑی آنکھیں بس کھلی ہوئی تھیں
جیسے اب اس کو نیند کبھی آئے گی نہیں۔ اور وہ دن رات جاگا کرے گی۔
اس نے ایک بار پھر کروٹ لی، اور چہرے پر رکھے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں
کی دراروں میں سے جھانک کر دیکھا کہ ارشد کیا کر رہا ہے کیا واقعی سو
رہا ہے یا صرف بنا پڑا ہے، وہ آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش
کر رہا تھا اور وہ ایک بار پھر کھانسی جیسے اس کو دمہ ہو گیا ہے اور ایک
پھر پیروں کو جھٹک کر بولی۔
"نہ جانے آج نیند کیوں نہیں آتی" ارشد دم سادھے چپکا پڑا رہا۔
غزالہ نے انگڑائی لے کر اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا کرکے پلنگ پہ ڈال دیا۔

"نیند نہیں آتی" اس نے اس انداز سے یہ جملہ ادا کیا گویا ارشد نے اس کی آواز سنی ہی نہیں "کیا تم سو گئے۔"

"ہوں" وہ بیزاری سے بولا اور جلدی سے چادر منھ پر ڈال لی گویا اس نے سوتے میں ہوں کی تھی۔

"لیکن مجھے تو نیند نہیں آتی" وہ بچوں کی طرح سے بولی

آجائے گی" ابھی بجا ہی کیا ہے

"کب آئے گی" مجھے تو الجھن لگ رہی ہے

کوئی کتاب پڑھو، نیند آجائے گی،

کتاب میں جی نہیں لگتا

"آنکھیں بند کر لو

"الجھن جو ہو گئی ہے"

"تو بس پھر کے جاؤ"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے، غزالہ نے ایک دم بات چیت کا عنوان بدل دیا

"کاہے سے" ارشد نے آنکھیں کھول کر پوچھا

"کوئی آنگن میں چل رہا ہے وہ ـــــ وہ دیکھو پرچھائیں

"کہاں ؟" ـــــ وہ میری انگلی کی طرف "

"تمہیں وہم ہو گیا ہے"

"نہیں کوئی چور ہے، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے سفید جھوٹ
بولتے ہوئے کہا۔ یہ بلی جا رہی ہے دیکھو وہ کالی سی
"ہائے اللہ، ادھر ہی آرہی ہے" کالی بلّی سے بہت ڈر لگتا ہے۔
آج تم نے سونے کی قسم کھالی ہے
لیکن نیند جو نہیں آتی"
خواہ مخواہ دوسروں کی نیند خراب کر رکھی ہے چپکی لیٹو،
غزالہ نے پھر کروٹ لی،
"ارشد" وہ اٹھلائی

"ہوں"
"تمھارے پلنگ پہ آجاؤں"
کیوں"
شاید نیند آجائے۔
بھئی مجھے سونے دو
"تو پھر میں بھی سو جاؤں گی،
"اپنے پلنگ پر نیند نہیں آتی
"نہیں، اس میں کھٹمل بہت ہیں
تو دوسرا پلنگ لے آؤ۔

"سب سو رہے ہیں۔ آنکھ نہ کھل جائے گی"

"میرا پلنگ چھوٹا بہت ہے"

"تو ہرج ہی کیا ہے؟"

مجھے الجھن ہوتی ہے" وہ کسمسایا

"سردی جو ہے"

تو اس سے کیا

"جاڑے میں ساتھ لیٹنے میں برا نہیں لگتا" وہ بولی

اتنے میں بلی زور سے بولی، اور وہ دھڑ سے ارشد کے پلنگ پہ گر

پڑی" مجھے ڈر لگ رہا ہے"

اچھا خدارا اب چپکی بیٹھو"

مجھے ذراسی جگہ دو" وہ لحاف میں گھستی ہوئی بولی

"تمھی یہ سرہٹاؤ، میرے منہ پہ بال آرہے ہیں" اس نے اپنا سر اس

کے منہ سے ہٹا دیا ——— "ادھر ادھر کھسکو نا ———"

"کدھر کھسکوں"

"تھوڑا سا ادھر" وہ بولا

نیچے نہ گر پڑوں گی"

"گر پڑو گی ——— وہ چلا کر بولا۔

"تو تم مجھ سے چڑتے ہو" "بالکل" اس نے عاجز ہو کر کہا

"اگر مر گئی تو رو ؤ گے"

"ہرگز نہیں"

"بڑے ظالم ہو" وہ شکست کھاتے ہوے بولی

"ظالم نہیں کچھ اور" وہ آہستہ سے بولا

"جاؤ ہم نہیں بولتے" وہ جھوٹ موٹ بگڑ کر بولی

"ہم تو خدا سے یہی چاہتے ہیں"

"تب تو میں ضرور بولوں گی" وہ تن کر بولی

"میں کہتا ہوں سو جاؤ" ورنہ باہر جا کر سو رہوں گا" وہ گرج کر بولا

"لیکن نیند کو کیا کروں، آتی ہی نہیں

اچھا اب بک بک ختم کرو مجھے نیند آرہی ہے

وہ لیٹے لیٹے لیمپ کی روشنی کو گھورنے لگی، ہزاروں پتنگے ناچ رہے تھے اور کچھ گر رہے تھے، وہ بڑی دیر تک چپکے لیٹے دیکھتی رہی اور پھر ایک دم اس کو ارشد کا خیال آیا، وہ اس کو ایک دم گھورنے لگی، وہ کب کا سو چکا تھا دھیمے دھیمے خراٹوں کی آواز آرہی تھی، اور وہ اس کو دیکھتی رہی، نہ اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور نہ سکون، وہ اب بھی پریشان رہی تھی

شاید دوسرے پلنگ کے کھٹمل اب اس پلنگ میں آگئے تھے۔

پہلی ٹھوکر

جیسے ہی گاؤں کی کنواریوں نے ڈھولک پر ہاتھ مارا اور رسیلے گلوں سے تھراتے ہوئے بول نکلے تو فضا خود بخود مسکرا دی، رنگ برنگی کپڑوں میں مسکراتی ہوئی الھڑ جوانیاں انگڑائیاں لینے لگیں۔

شراب سے زیادہ بدمست اور رنگ تھا کہ نکھرتا چلا آرہا تھا۔ کچھ لوگ ایک شرمیلی سی جھینپی سی لڑکی کو جو لال بھڑکیلے کپڑوں میں اور چاندی کے بھاری بھاری زیوروں کے بوجھ سے دبی ہوئی بیٹھی تھی، سجا رہے تھے، جوانی سنواری جا رہی تھی، کسی کو دیوانہ بنانے کے لئے کہ جیسے ہی وہ اجنبی جو اس کا شریک زندگی ہونے والا ہے۔ اس کو دیکھے پاگل ہو جائے اور وہ گوشت کا لوتھڑا جو خاموش اور ساکت سرخ کپڑوں میں لپیٹ کر زبردستی اس کے حوالے کیا جا رہا ہے، اس کے ہر حکم کو مان لے ——— اور پھر ایک مرد کے ہوش و حواس گم کر دینے کے لئے یہ سریلے گیت نوعمر لڑکیوں کی باریک رسیلی آوازیں اور سجی سجائی دلہن جس کی ہر جنبش پہ ہر حرکت پہ چوڑیاں اور پازیب دردیلے گیتوں کی سنگت کر رہی تھی۔ کافی تھی لڑکیاں کوٹھے کی چھت پر بیٹھی گائے جا رہی تھیں اور دلہن اب تیار تھی۔ کبھی کبھی اس کی گردن کی جنبش پہ چھوٹے سے گھونگھٹ میں سے اس کا چمکتا ہوا چہرہ کوندجاتا تھا جو ماتھے پہ بل رہا تھا، شادانِ شادی

میں شریک ہوتے ہوئے بھی کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔ لڑکیوں کی جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے بھی وہ غیر دلچسپ معلوم ہو رہی تھی، گاتے گاتے اس کے منہ سے بول بند ہو جاتے اور پھر کوئی پاس بیٹھی ہوئی لڑکی اس کے ایک زور سے چٹکی لیتی اور اس کی دبی ہوئی آواز سروں سے الگ ہو جاتی اور پھر ایک دم ڈھولک بند ہو گئی۔ اور جیسے ہی دولہا اندر آیا، سب کی سب لڑکیاں اس پر ٹوٹ پڑیں، جیسے آسمان سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں، وہ اچھا خاصا چوڑا چکلا جوان تھا پھولوں کے سہروں کے اندر سے اس کی تیز نگاہیں کنواریوں پر پڑ رہی تھیں۔ جیسے وہ ان سب کو کھا جائے گی۔ دلھن گڑیا سی بنی سامنے بیٹھی تھی۔ اس خاموش لوتھڑے میں روح کا گزر ہی نہیں تھا، مگر شاداں بڑی دلچسپی سے کبھی دولھن کو اور کبھی دولھا کو دیکھ رہی تھی، اور اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اجنبی کو اتنے قریب سے دیکھ کر اس کے دل کی کیا کیفیت ہو گئی ہے۔ کمبخت خواہ مخواہ دھڑک رہا تھا، اس نے یوں تو مرد بہت سے دیکھے تھے۔ سلام جو روز کنوئیں پر پانی بھرنے آتا تھا کچھ مراثی سا۔ حبیب جو لکڑیاں کاٹتا تھا، مگر ہمیشہ گنگناتا رہتا تھا۔ اور ظہیر اسکو شاداں کی جوتی کا بھی توڑ نہ تھا۔ بس اس کو اپنے کام سے کام تھا۔ بس گاؤں بھر میں غنیمت تھا تو سلمان۔ مگر دولھا تو سلمان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ پھر شاداں سوچنے لگی۔ اگر اس کی شادی سلمان سے ہو جائے تو غنیمت ہی ہے بہ نسبت

ان بدھوؤں کے پھیر اب تک اس کی شادی ہوئی کیوں نہیں۔ وہ تو رضیہ سے دو سال ___ یعنی چوبیس مہینے بڑی ہے۔ اور رضیہ آج اپنے دولہا کے گھر جا رہی ہے۔ مگر اس کو اپنے دولہا کا اور انتظار کرنا پڑے گا۔ نہ جانے کتنے دن اور راتیں اس کی جوانی کے بغیر پیار و محبت کے یوں ہی گزر جائیں گی۔ پھیکی سی اور شاداں کو محسوس ہوا کہ جیسے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کو کسی چیز کی ضرورت ہے ___ پھر کچھ رونے کی آواز آئی تو شاداں چونک سی پڑی، اس نے دیکھا دولھن رخصت ہو رہی تھی اور اس کے عزیز رو رہے تھے، پاگل کہیں کے وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی، بھلا اس میں رونے کی کونسی بات ہے۔ وہ تو ایسی جگہ جا رہی ہے جہاں اس کی پوجا ہوگی۔ جہاں کوئی اس کے کانوں میں چپکے چپکے کہے گا۔ رضیہ، میں تم پر مرتا ہوں، تم بہت خوبصورت ہو، تاروں سے زیادہ روشن، اور جب دولھن رخصت ہوگئی تو وہاں کے ہوتے ہوئے بھی گھر سونا معلوم ہو رہا تھا۔ شاداں دولھن کے پلنگ کے پاس ہی لیٹ گئی اور سہرے کے چند ٹوٹے ہوئے پھولوں کو سونگھنے لگی۔ بڑی مست خوشبو تھی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوئی جا رہی تھیں، دور سے باجے کی آواز آ رہی تھی۔ دولھن کی پالکی ہولے ___ ہولے گاؤں سے گزر رہی تھی اور شاداں بکھرے ہوئے خیالوں کو یکجا کر کے سو گئی۔ دولھن کے گرے ہوئے پھولوں اور

اور کلیوں کو مٹھیوں میں بھینچ بھینچ ۔

دوسری صبح اس کی زندگی کی ایک نئی صبح تھی ۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے جیسے ہی اس نے انگڑائی لی وہ مسکرادی اور مٹھیوں میں دبی ہوئی باسی کلیاں گر پڑیں پھر ایک دم اس کو پچھلی رات یاد آگئی ــــــ اور وہ پلنگ پر سے اٹھ بیٹھی اور اپنے گھر جانے کے لئے تیاری کرنے لگی ۔ رضیہ کے مکان سے دو فرلانگ پر شاداں کا مکان تھا ــــــ پھر سب سے ملنے کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی ــــــ آج اس کی نگاہیں شرمیلی نہ تھیں ۔ بلکہ ایسا معلوم دے رہا تھا جیسے وہ اپنا شرمیلا پن کہیں کھو آئی ہیں اور اب ان نگاہوں کو کسی کی تلاش تھی ۔ درخت کے نیچے سلام پانی بھر رہا تھا اور جیسے ہی شاداں نے دیکھا وہ زبردستی کھنکھاری ۔ اور اپنے پیروں کو ٹپک ٹپک کر چلنے لگی

پازیب کی جھنکار سن کر سلام نے مڑ کر دیکھا اور پھر پانی بھرنے لگا اور شاداں تپ کر رہ گئی ۔ گویا اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں ــــــ مرا تی ہاتھوں سے ڈول کھینچنے لگا ــــــ اور شاداں تیز تیز قدم رکھتے اپنے گھر آگئی ۔ مگر جیسے ہی اس نے دروازے پر قدم رکھا ، اس نے سلامت کی آواز سنی ۔ وہ اپنے باپ کے پاس بیٹھا حقہ پی رہا تھا " بوڑھے باپ نے گردن اٹھا کر دیکھا " ہاں آگئی " اور وہ جان بوجھ کر دروازے کے پاس تن کر کھڑی ہو گئی ۔

رضیہ کی ماں نے بہت سا جہیز دیا ہے " خوب عمدہ اور سلمان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ چھوکری جوان ہو گئی ہے، وہ سوچ رہا تھا، اور شاداں مسکرا رہی تھی۔ اور پھر ایک روز یوں ہی دیکھتے دیکھتے مسکراتے مسکراتے وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے۔ گرم گرم گھبرائی ہوئی سانسیں ایک دوسرے سے چھو گئیں ـــــ شاداں سنجیدہ ہو گئی اور سلمان بیباک ـــــ گاؤں کی گھنی جھاڑیوں اور دھانوں کے کھیتوں میں جہاں چڑیاں اور طوطے چھپ چھپ کر بولا کرتے تھے اب دو پرچھائیاں قریب قریب نظر آتی تھیں جو ایک مرد کی تھی اور دوسری عورت کی۔ شاداں سوچتی بغیر مرد کے اس کی زندگی کس قدر نامکمل تھی کس قدر بے کیف، نہ کوئی اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا تھا، نہ کوئی اس کے کانوں میں کہتا " شاداں تو میری ہے صرف میری" اور پھر اس کا دل مسکرا اٹھتا، آنکھیں چمک جاتیں اور جسم بھر میں تیزی سے چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ چہرہ تمتما اٹھتا اور اس کا دل چاہتا۔ بس وہ زندگی بھر یہ خواب دیکھتی رہے۔ یہ نغمے سنتی رہے اور مر جائے۔ وہ سوچتی رہی وہ بھی ایک دن دلھن بنے گی، لال لال لچکے کے کپڑے پہنے گی۔ ماتھے پر چمکتا ہوا ٹیکا لگائے گی۔ لڑکیاں سہاگ گائیں گی اور پھر وہ سلمان کے ساتھ رخصت کر دی جائے گی۔ اس کا باپ روئے گا کہ شاداں

چلی گئی ۔ گھر سونا ہو جائے گا ۔ وہ مسکراتی ہوئی پالکی میں بیٹھ کر اپنے ساجن کے گھر میں قدم رکھے گی ۔ ایک نئی دنیا بسائے گی ۔ اور پھر سلمان اور وہ محبت کے ترانے گاتے گاتے ہنستے ہنستے مر جائیں گے ۔ اف کس قدر حسین ہے یہ زندگی ۔

پھر ایک دن اس کی شادی ہو گئی ، گاؤں کی لڑکیوں نے خوب سہاگ گائے ۔ دولہا آیا اور شاداں کو لے گیا ۔ تو وہ روئی نہ اس کو اپنا پرایا گھر چھوڑتے وقت رنج ہوا ، بلکہ وہ تو گھونگھٹ میں مسکرا رہی تھی سلمان کو دیکھ دیکھ کر ۔

جب اس کی پالکی سلمان کے گھر پہنچی تو عورتیں اس کی منتظر کھڑی تھی اور جلدی سے اس کو پھولوں سے زیادہ احتیاط سے اتارا اور پلنگ پر لٹا دیا ــــــ ہر ایک اس کا شیدا نظر آ رہا تھا ہر ایک کے ہونٹوں پر اس کی تعریف تھی ۔

"شاداں اور سلمان" چھوٹے سے گھر میں بس یہی دو نام گونج رہے تھے ــــــ صبح وہ دونوں خوش تھے ۔
شاداں اپنے گھونگھٹ میں مسکرا رہی تھی ــــــ اور اپنی قسمت پر نازاں تھی یوں ہی پانچ برس کا طویل عرصہ گذر گیا ۔

ایک دن شام کے قریب ایک ادھیڑ عمر کی عورت پانچ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لئے آہستہ آہستہ گاؤں میں داخل ہوی اور اس کی چال میں متوالا پن تھا اور نہ جوانی کی امنگ۔ پھر ایک چھوٹے سے گھر کے پاس آکر اس نے پکارا۔ آواز کے ساتھ ایک بڈھے نے کنجی کھول دی۔ اور بھرائی ہوئی آواز سے پکارا

"شاداں تو آگئی"؟

"ہاں آگئی بابو" وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی

"لیکن اطلاع کیوں نہ کرائی"

"اطلاع کس سے کراتی"

سلمان کہاں ہے؟" کیا تو اکیلی آگئی

اور پھر سسک سسک کر شاداں نے سب کچھ کہہ دیا۔ اور بچوں کی طرح سے اپنی گردن باپ کی گود میں ڈال دیا۔

"پھر اب کیا ہوگا شاداں؟" بڈھے نے پوچھا

"ہنسی کے دن گزر گئے، بابو اب رونے کی باری ہے اور یہ رونا زندگی بھر رہے گا۔

سلمان کے وعدے ٹوٹ گئے، جوانی گزر گئی، اور سلمان نے ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

دور کہیں سہاگ گائے جا رہے تھے، ڈھولک بج رہی تھی ۔

بنی میری سج گئی رے، سنہری گوٹے میں
سنہری گوٹے میں، روپہلی گوٹے میں

لڑکیوں کی باریک آوازیں فضا میں بلند ہوئیں ، اور فضا کو چیرتی ہوئی افق کی طرف بڑھ گئیں ، اور شاداں نے پاگلوں کی طرح اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے ، اس کی پلکیں بھیگ گئیں اور ساون بھادوں کی طرح تین رو دے اندھیرا گہرا ہو گیا ۔ ستارے ماند پڑ گئے ، شاداں نے اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا لیا ۔

دور کہیں زور سے جھینگر بول رہے تھے ۔ اور شاداں اپنے بھیگے ہوئے گالوں سے بچے کو چمٹائے ہوئے تھی ۔

کی

حمیدہ نے کالج سے واپس آتے ہی کتابیں میز پر پٹک دیں، کچھ کتابیں ادھر گریں اور کچھ ادھر، اور وہ دیوار کا سہارا لیکر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی اسکی آنکھوں میں لال پیلے نیلے رنگ ناچ رہے تھے اور دماغ کی رگیں تو ٹوٹ رہی تھیں سر سے ڈوپٹہ سرک کر فرش پر آرہا تھا اسکی سانس تیزی سے چلنے لگی "امّی"، اس نے بالکل آہستہ سے پکارا، اور دوسرے کمرے سے اُسکی ماں تیز تیز قدم رکھتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو کلیجہ دھک سے ہو گیا معصوم چہرہ ذرا سی دیر میں کھلا کر رہ گیا تھا! ابھی صبح دس بجے وہ ہنستی ہوئی کالج گئی تھی اور اس وقت یہ حالت!

"حمیدہ" ماں نے بڑے پیار سے اس کا سر اونچا کیا۔ کیسی طبیعت ہے؟" اور اس نے ماں کے شانے پر اپنا سر رکھدیا اور بولی "سر پھٹا جاتا ہے" ماں نے جلدی سے اس کو پلنگ پر لٹا دیا اور خود پنکھا جھلنے لگی۔ اس کی زندگی بھر کی کمائی صرف حمیدہ ہی تھی، جس کو اس نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا، راتوں کی نیند دن کا چین سب کچھ حمیدہ کی نذر کر دیا تھا۔ اس کی شادی کے بارہ برس بعد وہ پیدا ہوئی تھی۔ بڑی خوبصورت بھولی سی بچی اور جب وہ تین برس کی ہوئی تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور اسکی ماں نے اپنی پوری جوانی اسی کے پیچھے گذار دی۔ اب وہ جوان تھی اور ماں کی کل کائنات صرف حمیدہ کا مسکراتا ہوا چہرا تھا۔

جب وہ پیار سے کہتی "امی" آپ مجھے کتنی اچھی لگتی ہیں، دل چاہتا ہے آپ کو اپنے کلیجے میں رکھ لوں" تو اس کی ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آتے اور وہ بڑی محبت بھری نگاہوں سے اس کو دیکھتی اور کہتی " حمیدہ میری جان" اسکی ہمیشہ یہی دعا ہوتی کہ وہ حمیدہ کو دنیا میں چھوڑ کر جائے، مگر آجکل بیحد پریشان تھی، کمرے میں چھپ کر روتی، تڑپتی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے حمیدہ کی صحت کیلئے دعائیں کرتی۔ مگر اب سر کے درد کے ساتھ ہی ساتھ بخار بھی رہتا تھا، نازک سی جان مرجھائی جا رہی تھی اور اس کی ماں دن رات اس کے پلنگ کے قریب بیٹھی رو دیا کرتی۔ رات بھر بارش ہوئی اور کالی گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی تھیں۔ بجلی کی چمک، بادل کی گرج دلوں کو ہلائے دے رہی تھی۔ "امی" اس نے کانپتی ہوئی آواز سے پکارا اور اس کی ماں ایک دم چونک اٹھی جیسے کسی بھیانک خواب سے جاگ اٹھی ہو، "ہاں میری حمیدہ" اور وہ اس کا گرم گرم ہاتھ سہلانے لگی۔ "آپ نے کچھ سنا ہمارے کالج میں ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام تھا دیکھئے میرے دماغ سے اس کا نام اتر گیا ہے ـــــ ہاں تو اس کا نام تھا رفعت۔ بڑی پیاری حسین لڑکی تھی، بلا کی شریر ہر وقت دوسروں کو ہنسایا کرتی تھی مگر امی آپ کو سن کر سخت تعجب ہوگا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر مر گئی "مر گئی" اس کی ماں نے گھبرا کر پوچھا وہ کیسے؟

صرف سر کے درد میں اور اسکی ماں کا دل سن سے ہو کر رہ گیا

"یہ سر کا درد بہت خراب ہوتا ہے۔ امی بیچاری رفعت اسی میں مر گئی، بالکل

بالکل جوان تھی اور بیحد خوبصورت اس نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی تو اب معلوم ہوا کہ وہ برسوں کی
بیمار ہے اور ماں نے جلدی سے اپنی کوکھ پہ ہاتھ رکھ لیا "ایسی باتیں نہیں کرتے حمیدؔ" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا
دیکھیئے امی یہ دنیا کے دستور کتنے عجیب ہیں۔ جب تک انسان زندہ رہتا ہے سب کچھ کرتے ہیں
پیار بھی محبت بھی ادھر روح نکلی تو پھر سب جلد از جلد اس کو مٹی سے چھپا دینے کی کوشش کرتے ہیں
خواہ وہ کتنا ہی پیارا عزیز کیوں نہ ہو" ٹپ ٹپ کرکے بے اختیار اس کی ماں کے آنسو گر پڑے
اور اس کو ایسا محسوس ہوا کہ حمیدہ اس کے رستے ہوئے ناسور کو کرید رہی ہے اور پھر ایک دم
بجلی چمکی اور حمیدہ نے ڈر کر ماں کی گود میں اپنا سر رکھ دیا۔ رات بھر وہ اسی طرح سکڑی ہوئی ماں
کی گود میں پڑی رہی دوا پر دوا بدلی گئی ڈاکٹر پر ڈاکٹر آئے مگر بیماری بدستور قائم رہی اور پھر ایک تیسری
رات کو جب ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی وہ اسی طرح بستر پہ پڑی چیخ رہی تھی ماں نے انار کا شربت بڑھاتے
ہوئے کہا "حمیدہ تھوڑا سا شربت پی لو" تو اس نے بڑی نفرت سے منہ پھیر لیا اور بولی "کیا کروں
پی کے" "تورا دل کو سکون آجائیگا" اور وہ مسکرا دی پھیکی پھیکی مسکراہٹ خشک ہونٹوں پہ پھیلنے
لگی اور وہ سوچنے لگی، اسکی امی کتنی سیدھی سی ہیں وہ یہ بھی نہیں جانتیں کہ اسکو دق ہو چکی ہے
اور یہ گھن اس کے جسم کو کھوکھلا کئے دے رہا ہے۔ بھلا یہ انار کے چند گھونٹ اس کو پہلے کی سی طاقت
کب بخشنے لگے۔ مگر ماں کی محبت! "امی میری باہیں دیکھیئے" اور اس نے سوکھی سوکھی باہیں اٹھا کر
اپنی ماں کو دکھلائیں۔ "پہلے میں کسقدر تندرست تھی اور اب" اور ماں نے اس کا دل رکھتے
ہوئے کہا۔ "حمیدہ جب یہ بخار اتر جائیگا تو پھر تم ویسی ہی تندرست ہو جاؤگی چہرے پر سرخی دوڑ
جائیگی اور میری حمیدہ پھر ہنستی ہوئی نظر آئے گی" اور وہ جلدی سے بول اٹھی "تو مگر ان کی رخصت

تو اچھی نہیں ہوئی"۔ اور اسکی ماں نے فوراً بات کا موضوع بدل دیا۔ "حمیدہ وہ تمھارے نئے کپڑے سل کر آگئے ہیں۔ کل پہن لینا کب تک یوں ہی پڑے رہیں گے۔"

"میرے کپڑے! مگر کیا کروں گی پہن کر، دن رات تو بس اسی پلنگ پر پڑی رہتی ہوں اور پھر ان پتلی پتلی ٹانگوں پر وہ شلوار ہڈیاں نکلے ہوئے جسم پر قمیص اور کریپ کا دوپٹہ کیا اچھا لگے گا امی آپ کسی اور کو دیدیجئے، میں شاید نہ پہن سکونگی"۔ اور ایک دم اس کو کھانسی آنے لگی اور ماں نے جلدی سے دوا کے چند قطرے اس کے حلق میں ڈال دئے جب ذرا سی کھانسی رکی تو نڈھال ہو کر اس نے اپنا سر تکیہ پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ رات بھر ماں پلنگ کے قریب بیٹھی ہاتھوں کو سہلاتی رہی۔

صبح آہستہ آہستہ اس کی ماں اٹھی اور بالکل چپکے چپکے دودھ گرم کرتی رہی کہ کہیں اسکی آنکھ نہ کھل جائے جب وہ دودھ ٹھنڈا کر کے لائی تو حمیدہ بالکل اسی طرح سے سو رہی تھی جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی جیسے ہی اس نے اس کو بیدار کرنے کے لئے اس کا جسم چھوا تو وہ برف کی مانند ٹھنڈا ہو رہا تھا کمھلائے ہوئے چہرے پر ہلکی ہلکی پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور پپڑی لئے ہوئے ہونٹوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

روح کا پنچھی نہ جانے کب کا پھڑ پھڑا کر اڑ چکا تھا۔ جسم کا خالی پنجرا پڑا بیکسی پہ ماتم کر رہا تھا، اور ایک طرف کو کھ جلی ماں اپنے سینے کو پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی اور دوسری طرف کلی کمھلا چکی تھی۔

یا اللہ بارش نہ ہو

بادل امنڈتے ہی چلے آرہے تھے۔ ہر طرف اندھیرا سا پھیلتا جا رہا تھا اور فاطمہ کا دل ڈوبنے لگا اس نے گھبرا کر کھڑکی سے جھانکا تو اس کا دل لرز اٹھا اس نے اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کر لیں۔ آسمان سیاہ نظر آرہا تھا، کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے تیزی سے دوڑ رہے تھے۔" یا اللہ بارش نہ ہو۔" اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ کشن کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ وہ کب تک اپنے راز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے رکھتی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ آج مایوس ہونے سے پیشتر وہ دنیا بھر سے چلا چلا کر کہہ دے کہ وہ ہاشم کو چاہتی ہے وہ بغیر ہاشم کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور ہاشم کے جانے سے پیشتر وہ ضرور بندر پر اس سے ملے گی۔ خواہ اس کو کسی قسم کی قربانی کیوں نہ کرنا پڑے وہ اپنی زندگی سے بیزار سی ہو چکی تھی۔ اس کی ماں اب تک اس کو بچی ہی سمجھتی تھی۔ گو کہ وہ اب بائیس برس کی جوان لڑکی تھی۔ اس کی زندگی اب کورس کے خشک مضامین سے گھبرا گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی سائنس کی موٹی موٹی کتابوں میں آگ لگا دے۔ اس گھر سے جہاں اس کی ماں نے اسے دودھ پیتی بچی سمجھ رکھا تھا نکل کر بھاگ جائے۔ وہ اپنے گھر کی مالک ہوتے ہوئے بھی آزادی سے اپنے گھر میں سانس نہیں لے سکتی تھی۔ ہر طرف رکاوٹیں چاروں طرف پابندیاں اس کی ماں اس کو پھول سمجھتی تھی اور ہر وقت اس کو گرم ہواؤں سے چھپائے رکھتی کہ کہیں

اس کا پھول کمہلا نہ جائے۔ وہ سمجھتی تھی کہ فاطمہ معصوم ہے وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ دن رات کتابوں کا کیڑا بنی رہتی ہے مگر وہ اس سے لاعلم تھی کہ قدرت پابندیوں کی محتاج نہیں۔ وہ ہاشم سے اتنی سخت پابندیوں کے باوجود بھی کئی بار بند کے کنارے مل چکی تھی۔ رکاوٹیں اور پابندیاں پہاڑ کی طرح سے اپنی جگہ پر قائم تھیں اور فاطمہ ان پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط پابندیوں کو روندتی ہوئی ہاشم سے ملی۔ اس کی ماں کو کانوں کان تک خبر نہ ہوئی کہ اس کی فاطمہ اندھیری رات میں اپنے کمرے سے غائب تھی۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ وہ پڑھ رہی ہے۔ دن رات پڑھتی ہے خدا اس کی آنکھوں کو بچائے آج بارش کے آثار نے اس کے اوسان خطا کر دئے تھے۔ اگر بارش ہو گئی تو وہ کیسے اپنی ماں سے بہانہ کرے گی۔ اس وقت اس گرج تڑپ اور بارش میں اس کے کالج میں اسپورٹ ہیں۔ وہ اس کو کبھی نہ جانے دیں گی۔ پھر وہ کیا کرے کس طرح ہاشم سے ملے اور پھر وہ جا رہا تھا۔ نہ جانے کب واپس آئے۔ اور وہ گھبرا کر ٹہلنے لگی۔ وہ گھڑی گھڑی دعائیں مانگ رہی تھی "خدایا بارش نہ ہو" یہ بادل واپس چلے جائیں اور پھر اس نے سنا آنگن میں اس کی ماں ٹہل ٹہل کر زہرہ سے کہہ رہی تھی "کم بخت کتنی سخت گرمی ہے۔ یہ بادل روز آتے ہیں اور آ آ کے چلے جاتے ہیں پر بارش نہیں ہوتی۔" خدایا اب تو رحم کر" اور فاطمہ کا دل سن سے ہو گیا۔ اگر اس کی ماں کے بجائے کوئی اور دعا مانگتا تو وہ اس کا منہ کچل دیتی اور پھر وہ جلدی جلدی دعا مانگنے لگی "یا اللہ بارش نہ ہو۔" "یا اللہ

بارش نہ ہو۔

اس کے جانے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا۔ اس نے بند کے کنارے ہاشم سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بیقراری سے بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاید یہ گھڑی سست ہے آدھ گھنٹہ سست۔ وقت گزرتا ہی نہیں اور اس کی تیلی تیلی سوئیاں اپنی جگہ سے ایک دم کیوں نہیں ہٹ جاتیں۔ شاید زنگ لگ گیا ہے ان میں اتنے میں اس کی ماں اندر آگئی۔

"فاطمہ! ہائے خدا کیا اس وقت کہیں جا رہی ہو؟"

"نہیں اور پھر وہ ایک دم چونک کر بولی "ہاں"

"کہاں جاؤگی اس وقت دیکھتی نہیں ہو آسمان کس قدر گھرا ہوا ہے۔

"لیکن مجھے تو جانا ہی ہوگا۔ کالج میں آج اسپورٹ ہیں

"مگر بارش میں کیسے ہوں گے۔ ان کالج والوں کا بھی دماغ خراب ہو گیا ان کو اس کا خیال نہیں کہ لڑکیاں بھیگ جائیں گی۔ عجیب کالج ہے۔ . . . خیر تم مت جانا

"لیکن میں تو لڑکیوں سے وعدہ کر چکی ہوں" وہ سفید جھوٹ بول رہی تھی۔

لیکن فاطمہ تم بارش میں نہیں جاسکیتں۔ اچھی لڑکیاں ہمیشہ کہنا مانتی ہیں اور تم بھی ایک اچھی لڑکی ہو" اور اس کا دل چاہا وہ کہدے وہ اچھی لڑکی بننا نہیں چاہتی اور اس کے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گر پڑے، اور باہر ٹین پہ اولے گر رہے تھے اور سخت بارش ہو رہی تھی۔ اس کا سر جھکپانے لگا۔ بند پہ ہاشم اس کا منتظر ہوگا۔ پھر وہ کیسے اس تک جائے۔

اس کی ماں نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس کی فاطمہ ایک مرد سے محبت کرتی ہے۔ جس کو اس نے مردوں کی تیز نگاہوں سے چھپا چھپا کر رکھا تھا اور ہوا بھی نہ لگنے دی تھی۔ یکایک فاطمہ کو محسوس ہوا کہ کسی نے آہستہ سے اسے پکارا ہے "فاطمہ" اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پھر اس نے دیکھا کھڑکی کے باہر کوئی پرچھائیں چل رہی ہے۔ وہ آہستہ سے اٹھی۔ جیسے ہی پردہ اٹھایا اس کے منہ سے ایک باریک چیخ نکل گئی

"ہاشم"

صبح کو جب اس کی ماں اس کو بیدار کرنے کے لئے اس کے کمرے میں آئی تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ فاطمہ کے پلنگ کے قریب ایرانی سفید قالین پہ مردانے جوتوں کے کیچڑ کے نشان بنے ہوئے تھے اور وہ سوچ رہی تھی یہ نشان کیسے؟ شاید باہر سے کوئی بلی اندر آ گئی اور اس کی معصوم بچی کو خبر تک نہیں ہوئی کہ اس کا پسندیدہ قالین خراب ہو گیا۔ کتنی بھولی ہے!

ایک ہی غلطی

ایک تیز جھٹکے کے ساتھ ٹرین رک گئی اور جیسے کسی نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا زرد زرد چہرہ مسکرا اٹھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگیں وہ مسرور تھا۔ بیحد خوش۔ آج پانچ برس کے بعد وہ اپنے گھر واپس آرہا ہے اس کا پیارا سا گھر۔ اس کا اپنا گھر جس کی ہر چھوٹی بڑی چیز اس کی اپنی تھی۔ جس کو بڑے فخر سے وہ اپنا کہتا تھا۔ اس کا ننھا سا باغ جس کی کیاریوں میں اس نے اپنے ہاتھ سے گلاب کی قلمیں لگائی تھیں وہ ہارسنگھار کا بڑا سا درخت جس کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ عطیہ کو چھیڑا کرتا تھا۔ اس کے بالوں کو بگاڑا کرتا تھا اور وہ بناوٹی غصہ سے اس کے ہاتھ میں کاٹ لیتی تھی پھر اس کو چھوٹی سی یاد آئی جس کے سجانے میں اس کی زندگی کی نہ جانے کتنی راتیں گزر گئی تھیں۔ بارہا وہ کتاب کو سینہ پر رکھ کر سو گیا اور صبح جب عطیہ اس کو جھنجھوڑتی کہ وہ بجائے اپنے بستر کے کرسی پر رات بھر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ عطیہ اس کے گلے میں باہیں حمائل کر کے کہتی۔ خالد تم کتنے عجیب ہو، مجھے یوں اکیلے کمرہ میں تنہا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں سو گئے، اگر میں ڈر جاتی تو کیا ہوتا؟ اور وہ مسکرا کر اس کے رخسار دبا دیتا پھر شادی کے ایک سال بعد ہی اس نے اپنا نام ایر فورس میں لکھوا لیا پانچ سال تک وہ مختلف مقامات پر پھرتا رہا۔ اس کی زندگی کے پانچ سال ایسے تھے جن کو

وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ لڑائی کے خوفناک میدانوں میں توپوں کی خوفناک آوازیں بموں کے پھٹنے کی صدائیں۔ زخموں کی پکاریں، خون آلودہ زخمی جسم رستے ہوئے ناسور، سڑی ہوئی بدبودار لاشیں۔ مگر وہ زندہ رہا۔ خار دار جھاڑیوں میں بھوکا پیاسا چھپا چھپا پھرتا۔ دھوئیں سے پر فضائیں اس کا گلا گھونٹے دیتی تھیں نہ اس کی زندگی میں خوشی تھی نہ مسکراہٹ۔ وہ اپنے وطن سے دور اپنی زندگی گزار رہا تھا، پھر یکایک اس کے دماغ میں ایک ہلکی سی پرچھائیں ایک حسین سایہ گھومنے لگا۔ جس کے سنہری بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ نیلی نیلی سی شریر نگاہیں لمبی لمبی پلکیں جن کا ہلکا سا سایہ ان کی آنکھوں کے نیچے چھپا رہتا۔ وہ بلا کی حسین تھی اور ایک رات قاہرہ کے کسی قہوہ خانے میں وہ اس سے ملا تھا وہ خالد کو دیکھ کر مسکرائی اور چلتے وقت وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ ایک نامعلوم سی آواز اس کو بلا رہی تھی اور وہ شلا کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا تھوڑی دور پہنچ کر وہ ایک کرتے پر مڑی اور مسکرا کر اپنے ساتھ آنے والے کو دیکھا۔ خالد کے پیر من من بھر کے ہو گئے۔ وہ مبہوت سا ہو گیا۔ اس کی رگ رگ سنسنانے لگی شلا نے مسکرا کر اپنے بازو پھیلا دئے۔ بھرے بھرے سفید بازو جن کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ اس کو محسوس ہوا کہ اس کا دل پسلیوں کو توڑ کر ہمک کر باہر آجائے گا ـــــ اس کا سیاہ لباس جن پہ چمکتے ہوئے ستارے لگے ہوئے تھے اس کے جسم کی ذرا سی جنبش پہ اس طرح جھلملا رہے تھے، جیسے آسمان پر تارے

جھلملاتے رہے آہستہ آہستہ اور وہ خالدہ کی آغوش میں کنول کی مانند لہروں کی آغوش میں کھو گئی۔

وہ اپنے قاہرہ کے مختصر قیام میں شلا سے روز ملتا اور ہر شام شلا اس کو نئی لگتی تھی۔ اس کا سر سراتا ہوا لباس اس کے جسم میں گدگدی کر دیتا ــــــ وہ بہار بن کر آئی تھی ــــــ اور خالد مدہوش ہو چکا تھا اور پھر لڑائی ایک دم ختم ہو گئی اور وہ اپنے وطن واپس آ رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا اس جنگ نے اس کو شلا سے ملایا تھا اور یہ جنگ اس کو اس سے چھڑا رہی تھی۔ کاش وہ سب کچھ بھول جاتا۔ یہ جنگ قاہرہ، شلا، اس کے پیار، اس کی آغوش۔ مگر یہ سب کچھ اس کے بس کا نہ تھا وہ جتنا بھولنے کی کوشش کرتا وہ اتنی ہی مسکراتی ہوئی اس کی نگاہوں میں آ جاتی پھر وطن کے قریب پہنچکر اس کو عطیہ یاد آ گئی اس کی بیوی جس کو پانچ برس کے عرصہ میں تھوڑا سا بھول چکا تھا۔ اس کی صورت، اس کی ہنسی، مگر پھر بھی وہ خوش تھا کہ اپنے گھر آ رہا ہے۔

اسٹیشن پہ پہنچکر اس نے چاروں طرف نظر ڈالی، سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا، وہی چہل پہل، وہی درخت وہی لوگ، وہ سوچنے لگا عطیہ اچانک اس کو دیکھ کر کس قدر خوش ہو گی، اس کی اپنی عطیہ، وہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کہیگا عطیہ اب میں تجھے کبھی بھی اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤں گا اور اب موت بھی مجھے تجھ سے جدا نہ کریگی، کیونکہ میں تو مر کے جیا ہوں ــــــ اور وہ اس کے قدموں میں تحفے ڈالدیگا

جو اس نے کس محنت سے شلا سے انتخاب کرائے تھے۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا ہوا چوروں کی طرح باغ میں گھسا۔ وہ حیرت سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا مگر اب اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کیاریوں میں گلاب کے درخت نہ تھے بلکہ وہاں سوئٹ پیز کے رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے درخت لگے تھے اور وہ ہار سنگھار کا پرانا درخت بھی کٹ چکا تھا اور اس کی جگہ پہ ایک لمبا سا یوکلپٹس کا درخت لگا تھا وہ اس تغیر پہ حیران بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ سامنے اس کی اپنی بیوی کے سونے کا کمرہ نظر آیا۔ جس کی کھڑکیوں میں نیلے رنگ کے جالی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کمرے کے اندر کوئی بول رہا تھا۔ ایک نئی آواز ــــ ایک مرد کی آواز۔ وہ بڑے غور سے اس کے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا ــــ اس نے جھانک کر اندر دیکھا ــــ تو ایک دم اس کا سر چکرا گیا ــــ آنکھوں کے تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک مرد عطیہ پہ جھکا ہوا تھا اور عطیہ کی آواز آبشار کے ترنم کی طرح گونج رہی تھی اس کو جیسے کسی نے اس کے سر پہ پھینک دیا اور ایک دھماکے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے تحفے زمین پہ آ رہے۔ اندر سے عطیہ نے چونک کر گھبرائی ہوئی آواز سے پکارا "کون" اور وہ لڑکھڑاتا ہوا وحشیوں کی طرح تیزی سے باہر نکل گیا۔

بہت دن گذرے

متواتر تین گھنٹے سے برف گر رہی تھی۔ بھوری چٹانیں اور اخروٹ کے درخت برف سے ڈھک سے گئے تھے۔ ہوا میں رات کے پھولوں کی مہک اڑ رہی تھی۔ ہم چاروں۔ کوکو نشو، رضا، اور میں کوٹ میں لپٹے ہوئے آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے، لیکن ہم لوگوں کے جسم سردی سے برفیلے ہوئے جا رہے تھے۔ کوکو بڑی سے ٹیٹنگ کر رہی تھی۔ اس کو ہمیشہ سے نئے ڈیزائن بنانے کا جنون سا تھا، وہ اس وقت بھی ایک نئے ڈیزائن کا سوئٹر پہنے ہوئے تھی۔ جس میں دو شیڈ دئے ہوئے تھے سیاہ اور گلابی۔ نشو عمر خیام پڑھ رہی تھی، جس کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا HOPE YOU WILL NOT FORGET اس کے بالوں میں CURL PINS۔ اور گہرے نیلے رنگ کی نائیٹی میں چینی کی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ رضا اونگ رہا تھا اس کی سفید سفید انگلیوں میں دبی ہوئی ۵۵۵ نمبر کی سگرٹ نیلے رنگ کے گھیرے بنا رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال جن میں خود بخود خم پڑ جاتے تھے اس کے ماتھے پر بکھر آئے تھے اور میں کچھ سوچ رہی تھی۔ خدا جانے جاڑے کی ٹھنڈی راتوں میں کچھ عجیب عجیب سے خیال کیوں آتے ہیں۔ آگ ڈھلتی جا رہی تھی کوکو نے ذرا سی راکھ کریدی۔ اور دبی ہوئی چنگاریاں چمکنے لگیں۔ میں نے اپنے سرد ہاتھوں کو کوٹ کی جیب میں چھپا لیا۔

کافی لاؤں" اف خدا یہ راتیں ۔ رضا تم قطعی بدذوق انسان ہو، بالکل بونگ صرف کالج میں بولنا جانتے ہو، اپنے کالج کی لڑکیوں سے خواہ کمبخت وہ چٹی ہوں یا کالی اور یا بھدی، مگر ان کے دماغ پہ تم اپنی خوش اخلاقی اور خوبصورتی کا ایک ایسا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہو کہ کالج کو چھوڑنے کے بعد بھی وہ تم کو نہ بھول سکیں ۔ تم ان سب کے سامنے اپنے کو بہتر سے بہتر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہو ۔ ہر وقت ٹیپ ٹاپ دیتے ہو ۔ تمہارے چہرے پر چھوڈی ہنسی رقصاں رہتی ہے ۔ تم حقیقت میں وہ نہیں ہو جتنا تم بنتے ہو ــــــ کوکو بڑبڑائے جارہی تھی ، رضا نے سگرٹ کے کئی گھونٹ ایک ساتھ ہی لئے اور سگرٹ اس کے ہونٹوں میں چپک گئی "شٹ اپ کوکو" نشو عمر خیام کی ایک رباعی زور زور پڑھنے لگی ۔

HEREWITHA LITTLE BREAD BENEHTH
THE BOUGA A FLASK OF WINE
ABOOT OF VERSE AND THOU

مجھے ایک دم ہنسی آگئی POOR BOY اور پھر مجھے ایک دم ناصر یاد آگیا جس کی تصویر اب بھی ہمارے ڈرائنگ روم میں لگی تھی ۔ اس کے سیاہ بال بڑی بڑی آنکھیں اور مردانہ کسرتی جسم ... وہ نشو کو پسند تھا بلکہ شاید ہم تینوں کو ۔ شاید وہ بیحد حسین تھا، بیحد خوبصورت، اور اس دنیا میں بلکہ صرف ہندوستان میں سچ پوچھو تو مرد بہت کم حسین ہوتے ہیں" یہ جملہ نشو نے ایک روز مجھ سے ناصر کے سامنے کہا تھا" مگر ناصر تو سحر زدہ ہو کر رہ گیا ہے ۔ اور اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی ۔ وہ

اکثر ہمارے یہاں آتا تھا چاندنی راتوں میں ہم سب پک نک کرنے گلمرگ جاتے تھے، وہاں اس قدر اودھم مچاتے ـــــ گاتے ڈانس کرتے کہ ہماری آوازیں سن کر انگریز اور امریکن اپنے اپنے خیموں سے ہم کو جھانکا کرتے تھے۔ اپنی چمکتی تیز نگاہوں سے گھورا کرتے تھے۔ لیکن رضا جب بھی مریل سا رہتا، ہاں اگر ہم تینوں بہنوں کے علاوہ کوئی غیر لڑکی ہمارے ساتھ ہوتی تو پھر اس میں جان پڑ جاتی تھی۔ اس کے کپڑوں میں خاص تکلف ہوتا۔ اس کے رومال سینٹ سے تر رہتے تھے اور ہم لوگ اس کو اس قدر تنگ کرتے، اتنا بناتے کہ اس کی ساری بناوٹ ختم ہو جاتی تھی پھر ایک دم ناصر کا ٹرانسفر ہو گیا اور اس کے جانے کے بعد ہماری سب دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ نشو عمر خیام پڑھنے لگی۔ کوکو نٹینگ کرنے لگی اور میں سوچنے لگی بہت سی فضول باتیں۔ پھولوں کی پتیاں خزاں کے گرم جھونکوں سے ٹکرا کر کیوں گر جاتی ہیں؟ ان نیلے پہاڑوں کے نیچے ایک لڑکی اور ایک مرد کیوں ملا کرتے ہیں کیا ان کا دل اکیلے میں دھڑکتا نہیں ... کیا ان کے قدم بوجھل نہیں ہو جاتے ـ ؟ مرد ایک سے محبت کرتے کرتے کیوں تھک جاتا ہے؟ کیا پھر اس کے خون میں اپنے محبوب کی قربت پاکر حدت نہیں ہوتی ـ ؟ وہ پیار کیوں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں ـــ؟ وہ گرم گرم آہیں نفرت میں کیوں بدل جاتی ہیں ـــــ ؟ ہائے اللہ یہ سب کیا ہے؟ یہ لڑکی جو ان نیلے پہاڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنے عاشق سے ملتی ہے۔ ایک دن ضرور اس کا محبوب اس کی آغوش سے اکتا جائے گا۔

اس کے پیار میں گرمی نہ رہے گی۔ نہ وہ آہیں بھرے گا اور نہ اس کے سینے پہ سر رکھ
کر اس کو چمٹائے گا —— اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ جائیں گے اور وہ بد نصیب لڑکی
اگر اس کی آغوش میں آنے کی ضد بھی کرے گی تو وہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیگا۔
اور یہ آگ اس لڑکی کو جلا کر خاک کر دے گی —— یہ مرد —— یہ مرد ——
میں نے اکتا کر اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ " خدایا توبہ یہ راتیں کس قدر بڑی ہیں
" کافی ٹھنڈی ہو گئی " کوکو بولی۔
آج کلب میں ڈانس ہے، آٹھ بجے ہم کو پہنچ جانا چاہیئے
" اف خدایا زندگی اور یہ لمبی راتیں " ہم لوگ کپڑے بدلنے چلے گئے ہم لوگوں
کے لباس کا رنگ سیاہ تھا۔ صرف چولیوں کے رنگ مختلف تھے۔ رضا ڈنر سوٹ
میں کچھ برا نہیں معلوم ہو رہا تھا —— ہم لوگ کندھوں پہ کوٹ ڈالے ہوئے
چنار اور اخروٹ کے درختوں کے قریب سے بالکل خاموش جا رہے تھے
جس وقت ہم لوگ کلب پہنچے تو آرکسٹرا پہ ایک بہت ہی اداس نغمہ بج رہا تھا۔
ہال میں کافی لوگ تھے۔ جن میں سے زیادہ تر انگریز تھے، مسکراتی ہوئی قوم کے
لوگ جو زندگی تلخ شراب کا ایک قطرہ مسکراتے ہوئے پی جاتے ہیں۔
کھانے کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے صوفے پر واپس آ گئے ہمارے قریب ہی مسٹر
سالمن بیٹھے تھے جن کو ہم لوگ SAMMY کہا کرتے تھے، اور جن کی مردانہ
خوبصورتی کلب میں مشہور تھی —— اور شاید ان کو اپنی خوبصورتی کا احساس بھی تھا

اور باتیں اس قیامت کی کرتے کہ طبیعت کبھی سیر نہ ہوتی ——— "ہلو سیمی" ہم تینوں پکار اٹھے۔

"ہلو" رضا نے اپنا منھ بسور لیا "ہلو" اور پھر ہم لوگ نہ جانے کتنے عنوان پر باتیں کرتے رہے، ڈانس، شاعری، کشمیر کی حسین وادیاں، فرانس کی لڑکیاں سکنڈوار، سوشلزم اور فیشن، سیمی کو کشمیر پسند ہے وہ گھنٹوں لیک میں بوٹنگ کرتا ہے شالامار اور نشاط کی بہت سی تصویریں اس نے اپنی نیلی آنکھوں والی بیوی کو ولایت بھیجی ہے۔ وہ کہتا تھا "کاش کیتھرین یہاں ہوتی" اس کو اپنا گھر چھوڑے ہوئے پورے پانچ برس ہو گئے ہیں۔ اس کو ہندوستانی لڑکیاں بھی بہت پسند ہیں اور کیتھرین بھی۔ اس کو کیتھرین سے بھی عشق ہے اور جوان خوبصورت ہندوستانی لڑکیوں سے بھی۔ اس کو کوکوکی سیاہ آنکھیں، نشو کے بال اور میرا بادی بہت پسند ہے۔ دنیا کہتی ہے، محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔ لیکن آج کل اس ترقی کے زمانہ میں یہ جملہ کتنا پرانا کس قدر بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔ آج کل تو ہر ایک اچھی چیز، اچھی صورت اور جوان جسم سے محبت ہو جاتی ہے وہی جوش، وہی گرمی، وہی امنگ، شاید زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ محبت کا فلسفہ بھی بدل گیا ہے ——— سیمی بار بار ہم لوگوں کے لباس اور بالوں کے Style کی تعریف کر رہا تھا اور اس کا خیال ہے ہندوستانی لڑکیاں بہت اچھی ہوتی ہیں اور ان میں SEX APPEAL قیامت کی ہوتی ہے بس فرق یہ ہے کہ وہ زیادہ

اپنے جسم کی پرواہ نہیں کرتیں ۔ بدنصیب ولایتی لڑکیوں کے ان کے پیر، پنڈلیاں اور رانیں اتنی خوبصورت نہیں ہوتیں ــــــ اور وہ MA KEUP کے معاملہ میں ابھی بچہ ہیں ۔ وہ نہیں جانتیں کس جلد کے لئے کون سے رنگ کا پوڈر مناسب ہوگا، کس رنگ کی لپ اسٹک کس موقع اور لباس کی مناسبت سے لگانا چاہیئے ــــــ پھر بھی اس کو ہندوستانی لڑکیاں پسند ہیں ــــــ ان کی جوانی، ان کا شباب اور ان کی چال ــ

سیمی بھی بھونرا ہے اور ناصر بھی اور دنیا بھر کے جوان ۔ اور بوڑھے مرد ــــ زمانہ اور وقت ان کا ساتھ دیتا ہے ۔ یہ دنیا یہ رسم و رواج، یہ سماج، یہ قانون، یہ سب کچھ ان ہی کا بنایا ہوا ہے ۔ اور ہم صرف ان میں کٹ پتلیوں کی طرح ہنستے اور روتے ہیں ــــــ اور تھک کر سو جاتے ہیں

پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ــــــ میرے ہونٹوں پر ناصر اور سیمی کے پیار سے چھا گئے ــــ اور میں نے نفرت سے اپنا منھ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا

چھن چھن کر کے کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز آئی اور ایک دم بلا کسی ارادہ کے میں
گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ گو کہ اس وقت سردی کے موسم میں جب کہ جسم تھر تھر کانپ رہا تھا لحاف
چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اس سامنے والے پیلے مکان میں
رہنے والے جوڑے سے دلچسپی سی ہو گئی تھی خواہ مخواہ جب طبیعت گھبراتی بس یونہی
دل بہلانے کے لئے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دیتی اور وہ چھوٹا سا پیلا مکان صاف
نظر آتا۔ کچھ میلا سا جس میں صفائی کا نام تک نہ تھا گندے سندے برتن بھنکا کرتے
ایک بوڑھی سی ماما جس کی رگ رگ ڈھیلی ہو چکی تھی بیٹھی اپنے میلے سے دوپٹے سے ناک پونچھتی
بڑی بڑبڑاتی ہوئی کھانا پکاتی نظر آتی اور خورشیدہ جس کی شادی کو صرف دو سال
گزرے تھے، سامنے والے کمرے میں اداس سی اکیلی پڑی رہتی اس کا زرد زرد
چہرہ، تھکی تھکی نگاہیں اور الجھے ہوئے سیاہ بالوں کی لٹیں بکھری ہوتی رہتیں تو میں نے
اس کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔ اور نہ تو جوان لڑکیوں کی طرح بن ٹھن کر بیٹھتے۔ بس وہ اچھی
خاصی ادھیڑ سی نظر آتی۔ چہرے پر البتہ تو ہر گز شادابی نام کو [illegible]
[illegible] اوپر والے کمرے [illegible] لڑکوں کے لئے
[illegible] تو کیسی [illegible] کا خیال [illegible] گایا جاتا۔
[illegible] اور خورشیدہ کے [illegible] کی جوانی [illegible]

موٹے آنسو گرنے لگے۔

اسلم گرج کر بولا ”مجھے تمھارے لکچروں سے نفرت ہے۔ اور اسی لئے تمھاری صورت سے بھی۔ کیا مجال جو زبان رکے قینچی کی طرح چلتی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں، خدا کی پناہ شوہر کو پیر کی جوتی سمجھتی ہیں، فیشن اور آزادی صرف دو باتیں یاد ہیں۔ عورت کو محبت چاہئے اونہ، مجھے عورت کے نام سے نفرت ہے“ وہ باہر چلا گیا اور پھر باہر والے کمرے سے کچھ لڑکوں کے ہنسنے کی آوازیں آئیں اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی بے سری تانیں!

اور میں نے گھبرا کر اپنا منھ کھڑکی سے ہٹا لیا۔ اف خدایا!! اس وقت میرا دل دنیا بھر کے تمام مردوں سے نفرت کرنے لگا۔ بھیڑئیے کہیں کے۔ صرف غرانا جانتے ہیں۔ اور پھر سوچنے لگی۔ رشیدہ بیچاری وہ بھی تو جوان ہے اپنے پہلو میں ایک ننھا سا تڑپتا ہوا دل رکھتی ہے۔ وہ بھی چاہتی ہے کہ محبت بھرے انداز سے کوئی ہولے ہولے اس کے بکھرے بالوں کو سلجھائے۔ پہلو میں بیٹھ کے میٹھی میٹھی باتیں کرے۔ وہ بگڑ جائے تو کوئی منائے وہ روئے تو کوئی اس کے آنسوؤں کو اپنے دامن سے خشک کر دے مگر یہ سب تو صرف ایک خواب تھا اور پھر وہی حقیقت تلخ اور زہر جیسی کڑوی۔

میں کھڑکی بند کر کے پلنگ پر لیٹ گئی دنیا بھر کے لیڈر، فلاسفر اور مصنف مجھے ظالم نظر آ رہے تھے یہ بھی تو مرد ہیں مجھے ایک دم نیتشے کا قول یاد آ گیا۔

"اگر عورتوں کے پاس جاؤ تو اپنے ساتھ ہنٹر لیتے جاؤ" اور مجھے اس جرمن فلاسفر سے نفرت سی ہو گئی مگر بقول برناڈ شا کے "عورتوں سے زیادہ ہنٹر مرد کے لئے بہت ضروری ہے" اور میرا بے اختیار دل چاہا کہ میں ایک ہنٹر سے ایسے تمام مردوں کی کھال اڑا دوں، یہاں تک کہ خون کے لال لال لوتھڑے نکل آئیں اور وہ چیخیں، چلائیں اور پھر میں مسکرا کر ان سے پوچھوں کہ دیکھو دل کی جلن کیسی ہوتی ہے۔

اس رات بڑی دیر تک میں جاگتی رہی۔ دوسرے دن خلاف امید مجھے مہینہ بھر کے لئے لاہور جانا پڑا۔ اور میں عرصہ تک رشیدہ کی حالت سے بیخبر رہی۔ خدا جانے کیوں مجھے اس کا خیال بار بار ستاتا رہا۔ جب میں واپس آئی تو سب سے پہلے کھڑکی کی طرف دوڑی مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہاں خلاف معمول اسی پہلے مکان میں انسانوں کا ہجوم تھا۔ لیکن عورت مرد سب ہی افسردہ نظر آ رہے تھے۔ میں بڑی دیر تک کھڑی رہی کہ شاید رشیدہ بھی نظر آ جائے مگر آخر مجھے ناکام لوٹنا پڑا۔
رات کو سونے سے پیشتر یونہی بلا کسی ارادے میں کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہوئی تو رشیدہ خواہ مخواہ ہنسے جا رہی تھی۔ اس کے پہلو میں کوئی مرد لیٹا ہوا تھا اور اس کو چھیڑے جا رہا تھا۔

زندگی کچھ اتنی خشک ہو گئی ہے کہ اب صرف عہد ماضی کی حسین راتیں اور پرکیف باتیں یاد کیا کرتی ہوں اور جب دل پہ زیادہ ٹھیس لگتی ہے تو لمبی لمبی پلکوں سے گرم گرم آنسو مچل کر گر پڑتے ہیں اور میں نڈھال ہو کر تکیہ کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر آنکھیں بند کر لیتی ہوں کہ یہ آنسو نہ گریں مگر میرا خیال کس قدر کمزور ہے۔ بھلا آنکھیں بند کر لینے سے دل کی کسک کیسے مٹ سکتی ہے اور یہ آنسو کیوں تھمنے لگے۔

تم کھو گئے میں کتنی اداس رہتی ہوں۔ کتنی افسردہ خاطر! مگر یہ بات نہیں ہے آج کئی روز سے تم مجھے بیحد یاد آ رہے ہو —— خدا جانے کیوں؟ یہ نہ سمجھنا کہ شاید مجھے تم سے خدانخواستہ عشق ہے یا محبت، جیسا کہ آج کل کے لوگ ہر وقت ہائے محبت وائے عشق " کیا کرتے ہیں۔ میں تو اس کو بالکل ڈھونگ سمجھتی ہوں۔ بھلا یہ بھی کوئی اظہار محبت کا انداز ہے کہ دوستوں کے سامنے رو رہے ہیں اخباروں اور رسالوں میں عشق و محبت کے خطوط لکھ رہے ہیں اور پھر تم اتنے خوبصورت بھی نہیں کہ کوئی عقلمند لڑکی تم سے محبت کرنے لگے۔ ہاں غنیمت ہو اتنے بدشکل بھی نہیں کہ تمھاری صورت دیکھ کر متلی ہونے لگے۔ مگر نہ جانے کیوں تم مردوں کی عقل کو زنگ لگ گیا ہے۔ بنتے ہو عقل مند مگر واللہ! میں تو تم لوگوں کو بالکل بدھو سمجھتی ہوں۔ تم دنیا کے نئے تیر ہو مگر ایک دبلی پتلی

خوبصورت لڑکی کے سامنے بالکل احمق پن کی باتیں کرنے لگتے ہو۔ تمہاری دانشمندی اور عقل کافور ہو جاتی ہے۔ اور ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہو۔ جیسے چوتھے درجہ کا کند ذہن لڑکا۔ مگر پھر بھی تمہیں اپنی عقل پہ ناز ہے۔ قربان اس سادگی کے!

گزرے ہفتے فریدہ نے اپنی سالگرہ کے موقع پہ کچھ میوزک کالج MUSIC COLLEGE کی لڑکیوں کو بھی ایٹ ہوم میں مدعو کیا تھا۔ بہت سے لوگ آئے تھے کچھ کوٹ پتلون والے اور کچھ شیروانی والے۔ کچھ فریدہ کے کلاس فیلوز اور باقی ادھیڑ عمر کے جج اور بیرسٹر۔ جب لڑکیوں نے کورس شروع کیا تو کیا بتاؤں ان عقل کے پتلوں کی کیا حالت ہو رہی تھی۔ ایک جج صاحب جو ذرا کالے سے ہیں۔ چہرے پہ جھریاں اور سر پہ گنج بری طرح برقرار نظر آرہے تھے۔ ایک کالج کے پروفیسر جو مدراسی ہیں۔ اس عمر میں اپنے کو جوان سمجھتے ہیں۔

بھئی اگر مجھ سے پوچھو تو مجھے کالے آدمی سے الجھن سی لگتی ہے۔ مگر دیکھا گیا ہے جتنے لوگ کالے اور بدشکل ہوتے ہیں وہ بری طرح حسین لڑکیوں پہ مرتے ہیں۔ ہاں تو پروفیسر ساؤتھ انڈین SOUTH Indian ہیں اور بیوی امریکن ۔ خدا جانے اس عورت کو یہ پروفیسر کیوں پسند آیا جو شادی کر لی۔

میں ان دونوں کو بلیک اینڈ وائٹ BLACK &WHITE کہتی ہوں۔

یہ پروفیسر ہے بہت قابل اور باتیں خوب کرتا ہے۔ امریکہ اور ولایت کے بڑے مزیدار قصے بیان کرتا ہے، ذرا دل پھینک ہے، ہاں تو پروفیسر آمنہ کو گھور رہا تھا جو صندلی لباس میں واقعی پیاری معلوم ہو رہی تھی، وہ یہ بھی بھول گیا کہ پاس ہی مسز بیٹھی ہیں اور وہ بھی امریکن، اگر کوئی ہندوستانی ہوتی تو خیر، مگر یہ معاملہ ہی اور تھا، وہ غصہ میں اٹھ کر گھر چلی گئی اور جوتوں کی کھٹ کھٹ سن کر پروفیسر کو ہوش آیا تو پیچھے بھاگا، خدا جانے گھر پہنچ کر بازی کس کے ہاتھ رہی

ہاں تو میں یہ کہنا ہی بھول گئی کہ تم مجھے کیوں یاد آرہے ہو، جب سے قاہرہ سے یہاں آئی ہوں، بالکل تنہا ہوں، اور کوئی اپنا نہیں جس کو عاجز کروں، مجھے یاد ہے جب میں تم کو چڑاتی تھی تو تم بگڑ جاتے تھے اور مجھ سے بات تک نہ کرتے تھے مگر جب قہوہ خانے میں تم مجھ کو دیکھ لیتے تھے تو مجھے کن آنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور میں بالکل انجان بن کر کوئی نیلی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھنے لگتی جیسے مجھے تمھاری نگاہوں کا احساس ہی نہیں۔ اف آج مجھے بغداد اور قاہرہ کی حسین راتیں بری طرح یاد آرہی ہیں۔

تمھارا ملک۔ اف خدا کی پناہ، کس قیامت کی گرمی ہوتی ہے۔ جہنم کا آدھا مزہ تو مئی جون میں آجاتا ہے اور میں خس کی ٹٹیوں میں چھپی لیٹی رہتی ہوں اور جب گرمی شباب پر آتی ہے تو کسی پہاڑ پر چلی جاتی ہوں۔ مسوری مجھے پسند ہے زندگی کا مزہ آجاتا ہے، وہاں کی فضائیں جیسے کوئی ایرانی حسینہ انگڑائی لے رہی ہو

ناگن کی طرح بل کھائی ہوئی سڑکیں، برف کے پہاڑ اور اونچی اونچی سبز پہاڑیاں، ٹھنڈی برفیلی ہوائیں اور حسینوں کے غول۔

تم بہت ہی بدمذاق انسان ہو جیسے تمھارے جوان خون میں گرمی کا نشان تک نہیں۔ تمھارے دل پر نہ گرمی اثر کرتی ہے نہ جاڑا۔ اور نہ ہی برسات کی بھیگی راتیں میں کہتی ہوں تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم نے جوانی میں ہی بڑھاپے کو دعوت دیدی تم جتنے بھی جتن کرو مگر سقراط اور رسالومن نہیں بن سکتے۔

میں تمھارے خشک ہندوستان کے ایک کونے میں پڑی ہوں۔ ماضی کی یاد اور چند دوستوں کی تصویریں بس یہی میری ملکیت ہے دو مہینے ہوئے کنٹیں میں میری ایک سہیلی نے میرا تعارف ایک کرنل سے کرا دیا۔ اچھا انسان ہے۔ مگر اس میں وہ جراثیم بھی بری طرح پائے جاتے ہیں۔ جو تمھاری جنس کا جزو ہیں یعنی لڑکیوں پر جان دیتا ہے۔ یقیناً تم میرے اس جملے پر منہ بناؤ گے۔ اگر سچ پوچھو تو مجھے تمھارا یہ منہ بنانا بہت ہی پسند ہے

اچھی خاصی شکل اگر تھوڑی دیر کے لئے بگڑ جائے تو حرج ہی کیا ہے۔ کوئی تم ہمیشہ کے لئے بدشکل ہو نہ جاؤ گے۔ جو خوبصورت لڑکیاں تم سے نفرت کرنے لگیں۔ ہاں تو مردوں کی حسب عادت اس کرنل نے مجھے اپنے بنگلے پر شاندار دعوت دی۔ وہ بار بار میرے لباس کی تعریف کر رہا تھا۔ "کیا آپ کسی انگریزی کالج میں پڑھی ہیں"؟ میں نے کہا "نہیں۔ صرف گھر پر" میرے اس جملے پر اس کو

بہت تعجب ہوا۔ کہ میں کتنی اچھی انگلش بولتی ہوں۔ اور میں اپنے دل میں ہنس رہی تھی کہ تمہاری قوم عورتوں کے منہ پر ان کی کس قدر تعریف کرتی ہے۔ اور پیچھے سن لو وہی رونا۔

"عورت ایک ناگن ہے، عورت ایک شیطانی سحر ہے۔ عورت ایک کانٹا ہے جو پھولوں میں چھپا ہے۔ عورت احمق ہے، بیوقوف ہے، اُلّو ہے نہ معلوم کیا کیا ہے۔ مگر میں تمہاری جنس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ کس قدر عقلمند ہے تمہاری قوم کہ عورت کے پیچھے برائی کرتی ہے اور منہ پر تعریف۔ "تم پھول ہو چاند ہو، کلوپیٹرا ہو۔" کرنل نے مجھے بہت سی اپنی تصویریں دکھائیں اور چمن میں کچھ نئے پھول دکھلانے لے گیا۔ وہاں اس کا کتا ٹہل رہا تھا۔ اس کا نام ہے Romeo بہت ہی خوبصورت، شاید تم سے زیادہ خوبصورت اور عقلمند۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ کتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور عقلمند Alsatian dogs ہوتے ہیں جب میں نے کرنل سے اس کے کتے کی تعریف کی۔ تو بہت ہی خوش ہوا اور مجھے ایک کتا دینے کا وعدہ کر لیا۔ دوسرے روز صبح جب میں غسل کر کے نکلی۔ تو کرنل کا چپراسی کتا لئے موجود تھا۔

میں نے اس کتے کا نام Gipsy رکھا ہے۔ بہت ہی شریر ہے۔ ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے اور میری جدائی برداشت نہیں کرتا۔ اکثر سوچتی ہوں کہ تم سے تو میرا Gipsy اچھا ہے۔ دیکھو کس قدر مجھے چاہتا ہے۔ مگر تمہاری قوم

اس ترقی کے زمانے میں بھی ابھی کتوں سے پیچھے ہے۔ میں کہتی ہوں تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ جس چیز پہ اعتراض کرتے ہو۔ اخباروں میں کالم کے کالم سیاہ کر دیتے ہو۔ اور پھر اسی چیز کو اپنا لیتے ہو۔ شاید وہ اس لئے کہ بری چیز کو دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہو جاتے ہو۔ اور پھر اس میں اچھائیاں نظر آتی ہیں اور پھر تم اپنے اعتراضات بھی بھول جاتے ہو۔ اب تو مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ تمھاری قوم بہت ترقی کر گئی ہے۔ صرف یہی نہیں، کرشن چندر بہت اچھے افسانے لکھتے ہیں اور اختر شیرانی کی نظمیں بہت پر درد ہوتی ہیں بلکہ یہ کہ اب تمھاری جنس صنف نازک کا سنگار اختیار کر رہی ہے اور اگر سچ پوچھو تو مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔ صرف کریم اور پوڈر ہی نہیں بلکہ لیڈیز رومال بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور وہ بھی بڑے وضعدار شاید یہ اس لئے کہ جب عورتوں نے مردوں کے کام چھین لئے تو مرد کیوں نہ صنف نازک کا فیشن اختیار کریں، مجھے ڈر ہے کچھ دنوں کے بعد پیٹی کوٹ اور under WEAR کی نہ باری آجائے تو پھر کیا ہوگا۔

ایک صاحب ریڈیو اسٹیشن سے مجھ سے ملنے آئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے۔ "آپ کو گانا آتا ہے" اگر نہیں تو پھر ڈرامہ میں حصہ لیجئے اگر آپ اس کو بھی ناپسند کریں تو پھر تقریر" سکریٹریٹ کا آفس ہو یا کونسل چیمبر، دربار یا ریڈیو اسٹیشن بات ایک ہی ہے۔ سب جگہ تمھاری ہی قوم ہے۔ اور ایک لڑکی کی ترقی کا زینہ ہے اس کی خوبصورتی، شراب میں بھی ہے نشہ ہے اور عورت میں بھی۔ شراب کا نشہ

کچھ عرصہ بعد اتر جاتا ہے۔ لیکن عورت کا نشہ مرد کے دماغ سے جب اترتا ہے جب وہ پرانی ہو جائے اور اس کی نگاہیں اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے تھک جائیں سوچتی ہوں جنگ ختم ہو جائے تو قاہرہ چلی جاؤں یہاں تنہائی نے مجھے سگرٹ کی عادت ڈال دی ہے۔ سب کہتے ہیں پھیپھڑوں میں داغ پڑ جائیں گے مگر میرا فلسفہ ہی کچھ اور ہے۔ یوں بھی تو میرے داغ پڑے ہیں۔ جن کو تم نہیں دیکھ سکتے صرف چہرہ ہی دیکھتے ہو۔ مگر میرے دل کے داغ نہیں دیکھتے۔ وہ لوگ جو لیڈر بن کر جھوٹے سچے لکچر دیتے ہیں، جیل جاتے ہیں، ان کو تم سچا سمجھتے ہو کیونکہ وہ لوگ کافی پروپگنڈہ کیا کرتے ہیں، چیخا کرتے ہیں "انقلاب زندہ باد" "انقلاب زندہ باد" مگر میں نہ لکچر دیتی ہوں نہ بجائے جیل کے ہوسپٹل "HOSPITAL" جاتی ہوں اور نہ ہی پروپگنڈا کرتی ہوں کہ "دیکھو میرے دل پہ داغ پڑ گئے" "دیکھو میرے دل پہ داغ پڑ گئے" میں تو احسان دانش کے اس شعر کی قائل ہوں،

جتنا غم بڑھنے لگا دل کو خوشی ہونے لگی
زندگی اب درحقیقت زندگی ہونے لگی

لیمپ کی روشنی دھیمی کر دو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ آنکھیں خود بخود جھکی جا رہی ہیں تم بھی کیا کہو گے کہ یہ لڑکی کس قدر رنگین ہے۔ چپ ہونے کا نام نہیں لیتی۔ میرے تو کان پک گئے اور مجھے تمہارا یہ منہ بنانا پسند ہے۔ اور کچھ بھی نہیں!

ایک رات اندھیرے میں

جیسے ہی راجو نے کمرے میں قدم رکھا اس کے دل کی دھڑکنیں کسی قدر تیز ہوگئیں سانسوں کا اتار چڑھاؤ خوف و پریشانی کی حالت میں گھبرائی ہوئی وہ تیزی سے صوفے کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں صرف ایک ہی لمپ جل رہا تھا جس کی سبز روشنی میں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی ، دیوار پر تین فلمی تصویریں لگی تھیں ۔ سامنے ایک بڑا سا آئینہ تھا۔ جس میں اس کا عکس صاف نظر آرہا تھا اور شاید اس کو وہ اپنا عکس پسند تھا ، جھینپی جھینپی سی نگاہیں جن میں بڑے احتیاط سے اس نے کاجل کی ڈوری لگائی تھی اور اس کے سیاہ لباس میں اس کی جوانی زیادہ دلکش نظر آتی ہے اس کے سانس کی تیزی اب کسی قدر کم تھی اور اب اس کو اطمینان تھا کہ ارشد نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ کپڑوں کی سرسراہٹ اور جوتوں کی چاپ اس کے قریب بڑھتی ہی چلی آرہی تھی اور پھر وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب ہی کھڑا ہو گیا

"یہ تصویر پسند ہے؟ اس نے ایک فلمی تصویر کی طرف اشارہ کیا

"ہوں" راجو نے گردن ہلا دی "بہت پسند ہے"

"معشوقہ جانتی ہو" اس نے ایک فلمی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں" راجو نے گردن ہلادی۔

"میں خود بھی واقف نہیں، مگر مجھے آرٹ سے عشق ہے۔ میرا بھائی جو اس وقت اٹلی میں قید ہے وہ ایک بہترین مصوّر ہے۔

"تمہارا بھائی۔ اس نے خوف سے اس کے چہرے کو دیکھا اور ارشد مسکرادیا، "ہاں میرا بھائی" آؤ ادھر بیٹھ جاؤ" اس نے راجو کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھادیا وہ جھجکی سہمی اور کونے میں دب کر بیٹھ گئی، "ڈرومت، میرے قریب بیٹھو، کل میں تمھیں اچھی طرح نہ دیکھ سکا، میرا خیال ہے تم بہت حسین ہو بہت شگفتہ" اور راجو مسکرادی، میرا خیال تھا، تم آج بھی نہیں آؤگی، بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا اور انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جارہی تھیں اور میرا شوق بڑھتا ہی جارہا تھا، کل تم کو دیکھنے کے بعد میں آرام سے سو نہ سکا۔

وہ اس کے اور قریب کھسک گیا اور اس کے شیشے کی رنگ برنگی چوڑیوں سے کھیلنے لگا۔

"کچھ پیوگی؟"

"نہیں"

"کچھ تو" بیرا! اور اس کی آواز کے ساتھ ہی دروازے پر کسی نے آہستہ سے پکارا، اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"دو گلاس جن" اور کچھ دیر بعد ہی شراب موجود تھی،

"لو" اس نے گلاس راجو کے ہونٹوں سے لگا دیا —— فوج میں رہ کر مجھ کو شراب کی عادت پڑ گئی ہے، لوگ کہتے ہیں شراب بری ہوتی ہے مگر ہر بری شے میں مزا ہے۔

اور ایک سانس میں وہ پورا گلاس خالی کر گیا۔

شراب، موسیقی، اور عورت، زندگی کو اسی چیز کی ضرورت ہے، کچھ بات کرنا دیکھتیں نہیں، وقت گزرتا چلا جا رہا ہے اور مجھے دس بجے اپنے بیرکس کو واپس جانا ہے ارے ہاں لو، میں تمھیں اپنا نام تو بتانا بھول ہی گیا مجھے ارشد کہتے ہیں اور تمھارا نام؟

"راجو" اور ارشد نے اپنا منھ اس کے منھ سے بھڑا دیا۔

"کبھی کسی سے محبت کی ہے راجو" اور اس کی گرم گرم سانس اس کے جسم سے چھو گئی۔

"نہیں، کبھی نہیں،

" ارے تم اتنی بڑی ہو گئیں اور اب تک کسی سے محبت نہیں کی شاید تمھیں کسی خاص آدمی کا انتظار رہو گا۔"

"ہائے بابو جی ایسا نہ کہو" اور راجو سوچنے لگی کیا بات کرنا ضروری ہے

"کیوں کیا ڈر گئیں، بڑی بھولی ہو، جوانی شروع میں جھجکتی ہے اور یہ جھجک اور بے حجابی ہی تو نام ہے جوانی کا —— ارے تم نے ابھی تک کچھ نہیں پیا

اور ارشد نے گلاس اس کے منہ سے بھڑا دیا ، جیسے ہی اس نے ایک گھونٹ پیا اس کو محسوس ہوا جیسے وہ اسپرٹ پی گئی ہو، حلق میں خراش سی ہونے لگی اور پھر کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں اور طبیعت بوجھل سی ہو گئی ،

"اب نہیں پیوں گی" اور راجو نے گلاس ہٹا دیا ـــــــ اس کی آنکھیں گلابی سی ہو رہیں آؤ ادھر لیٹ رہو" اور ارشد نے اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا ۔

آج مسلسل چھ ماہ کے بعد وہ ایک نوجوان عورت کو اپنی آغوش میں لئے تھا فوج کی خشک زندگی میں عورت جیسی لطیف شے کہاں ، سوائے خاموش اور جنگ میدانوں کے توپوں کی بھیانک آوازوں کے اور کچھ بھی نہیں اور پھر جب کوئی عورت مل گئی تو جیسے کائنات کی رنگینیاں سمٹ کر اس میں آگئیں اور ارشد اس دیہاتی لڑکی سے اپنے بھوکے پیاسے جذبات کی پیاس بجھانا چاہتا تھا ، عورت کسی رنگ میں ہو خوبصورت لگتی ہے ، شہر کی عورت، دیہات کی عورت بات ایک ہی ہے صرف انداز الگ ہیں ۔

اور پھر ایک دم اس کو " لوئی" یاد آگئی ۔ جب اس کی رجمنٹ کلکتہ میں تھی اور وہ اس سے پر ملا تھا ، بڑی حسین لڑکی تھی اور وہ اس کے حسن پر جان دیتا تھا دو مہینہ کے مختصر سے قیام میں وہ ہر شب اس سے ملا کرتا ، کبھی سینما میں کبھی ہوٹل میں ، غرضکہ ارشد

کی ہر تفریح" میں لوئی شریک تھی۔

وہ اس کے رخساروں سے کھیلا کرتا، اس کے بالوں کو سلجھایا کرتا اور "لوئی"، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اور وہ اس کے رخساروں پر ایک ہلکا سا تھپڑ لگا دیتی، اور ارشد کو وہ تھپڑ پسند تھے وہ مسکرا دیتا، پھر دو مہینے بعد اس کی رجمنٹ کلکتہ سے کہیں اور چلی گئی۔ وہ جہاز پر "لوئی" کے خواب دیکھتا ہوا چلا گیا اس نے کئی بار لوئی کو بڑے بڑے پارسل بھیجے، خطوط لکھے پھر کچھ عرصہ بعد دونوں کی محبت خاموش ہو گئی۔ شاید لوئی کو کوئی اور ساتھی مل گیا تھا، مگر ارشد کی جوانی سنسان راستہ پر کھڑی ایک لڑکی کا انتظار کر رہی تھی مگر کوئی عورت ادھر سے نہ گزری جو مسکرا کر اس کی جوانی کا خیر مقدم کرتی ———— پھر ایک دیہات میں اس نے راجو کو دیکھا کنوئیں پر پانی بھرتے ہوئے اور ارشد کو فوراً لوئی کا خیال آ گیا، گو کہ راجو نہ لوئی کی طرح خوبصورت تھی اور نہ اس میں وہ انداز تھے۔ مگر وہ جوان ضرور تھی، ایک سانولی سی لڑکی اور آج بہت کوشش کے بعد وہ اس کو ملی تھی"۔

"کیا سوچ رہے ہو بابو جی"

اور ارشد ایک دم چونک پڑا

"یوں ہی گھر یاد آ گیا" اور راجو اس کے جھوٹ کو نہ سمجھ سکی،

"گھر بہت یاد آتا ہے؟"

ہاں بہت،، میں تین برس سے اپنے گھر نہیں گیا۔ مگر اب تو تم مل گئی ہو شاید مجھے اب گھر کی یاد نہ ستائے ، اور ارشد نے اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ دیا، لیمپ بجھ گیا، کمرے میں اندھیرا سا ہو گیا، اور وہ تصویریں اندھیرے میں چھپ گئیں۔

صبح جب وہ کمرے سے نکلی تو عجب تھکی سی تھی ، نہ چال میں لچک تھی اور نہ تیزی جیسے وہ رات بھر جاگی ہو ـــــ اسی طرح وہ ہر روز آتی اور صبح چلی جاتی ـ پھر ایک دن رجمنٹ واپس جا رہی تھی ـــ کہیں اور ـــــ راجو ایک درخت کا سہارا لئے اپنے فوجی کو دیکھ رہی تھی ـــ وہ جا رہا تھا ـــــ اس کی جوانی سے کھیل کے کہیں اور ـــــ کسی اور شہر اور راجو اپنے پچھلے خوابوں کو تازہ کر رہی تھی ـــــ اور ہمیشہ کرتی رہے گی اور ارشد کچھ حسین لڑکیوں کے خواب دیکھ رہا تھا ـــــ جو لوئی اور راجو سے زیادہ حسین تھیں!

جیسے ہی رم جھم رم جھم مینہ برسا۔ گاؤں کے لڑکیوں نے آم کے گھنے گھنے درختوں میں جھولے ڈال دیئے اور دور دور سے ان کی سہیلیاں جمع ہونے لگیں اودے سبز اور دھانی ڈوپٹوں میں شرمائے ہوئے چہرے، مسکراتی ہوئی شریر نگاہیں، بل کھاتے ہوئے جسم اور لطیف قہقہے آموں کے درختوں کے سائے میں سنائی دینے لگے ہر طرف ہرے ہرے درختوں کی قطار اور گاؤں کی الھڑ دوشیزاؤں کے غول اٹھکیلیاں کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

آج پھول مت بڑی خوش نظر آرہی تھی، اس نے اپنے باپ سے بڑی منت خوشامد کر کے ایک دھانی چندری رنگوائی تھی اور آج وہ چندری اوڑھ کر پھولی نہ سما رہی تھی، ہوا میں لہراتی ہوئی دو چوٹیاں ناگن کی طرح اس کے شانوں پہ پڑی ہوئی بل کھا رہی تھیں۔ گھڑی گھڑی وہ اپنے ڈوپٹہ کو سنبھالتی اور وہ جھولے کے ایک ہی پینگ میں ہوا سے اڑ کر پیچھے آ رہتا۔ گاؤں والے اس کو ندری کہہ کر پکارتے تھے اور وہ اپنے حسن سے بیخبر کلی سے پھول بنتی جا رہی تھی وہ کلی اور پھول کا فلسفہ کیا جانے؟

ادھر گاؤں میں بڑا خوبصورت نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگ اس کی خوبصورتی دیکھ کر رشک کرتے تھے وہ اکثر پھول مت کے یہاں آیا جایا کرتا تھا۔

پہروں بیٹھتا اور پھول مت کے باپ سے گپیں اڑایا کرتا اور جب بڑھا حقے کے کش لگاتا تو وہ چپکے سے کن انکھیوں سے پھول مت کو دیکھا کرتا، جوانی اپنا ساتھی تلاش کر لیتی ہے خواہ وہ محلوں میں ہو یا جھونپڑوں میں۔

پھول مت نہ جانے کیوں بس خواہ مخواہ یونہی اس کو دیکھ لیتی اور چھپ جاتی شاید وہ بھی ادھیر کو چاہتی تھی، آخر دونوں چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملنے لگے، ندی کنارے آموں کے درختوں کے نیچے گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے، محبت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اور پھر ایک صبح گاؤں والوں نے سنا پھول مت ادھیر کے ساتھ کہیں بھاگ گئی۔

وہ دونوں خوش تھے اور ہمیشہ کے لئے اپنے کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ چکے تھے، ساون پھر آیا اور وہی رم جھم کے نغمے شروع ہو گئے، پھول مت ادھیر کے ساتھ جھولا جھول رہی تھی منہ پر منہ رکھے ہوئے دنیا سے بیخبر سماج کے بندھنوں سے آزاد۔

دن گذرتے گئے۔ بہت سے ساون آئے اور چلے گئے وہ اب بھی خوبصورت تھی اور ویسی ہی شگفتہ مگر ادھیر اب اس کے حسن سے تھک سا گیا تھا، وہی چہرہ وہی نگاہیں، وہی جسم، اور وہی آواز کوئی تبدیلی نہ تھی، بھلا وہ کب تک اس سے کھیلا کرتا، زندگی میں تبدیلی لازمی ہے اور پھر ایک دن روپا ادھیر کی دنیا میں بس گئی، پھول مت نے کئی راتیں رو رو کر گذار دیں، مگر اس نے اپنے گاؤں

واپس جانا پسند نہیں کیا۔ وہ سب کچھ برداشت کرتی رہی مگر جب ادھیر روپا سے اپنی کبھی ختم نہ ہونے والی محبت کا اظہار کرتا تو وہ تلملا جاتی اور گھبرا کر اندر سے باہر نکل آتی۔

"کیا محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے؟" اور پھر اس کے آنسو بجائے ساون کے رم جھم کرنے لگتے"

ایک دن روپا نے پھول مت کو نکال دیا، ادھیر سامنے کھڑا رہا، اور جب پھول مت جانے لگی تو بولا "اب کبھی ادھر نہ آنا" اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی منزل سے بے خبر چلی گئی۔ دل کے تار ٹوٹ چکے تھے اور بجانے والا نڈھال ہو کر سو گیا تھا۔

چار برس کا طویل عرصہ گزر گیا، پھول مت ادھیر سے دور اپنی زندگی کے دن گذار رہی تھی وہ زندہ تو اب بھی تھی، مگر اس کا دل مر چکا تھا ——— روپا ایک روز بھاگ گئی اور ادھیر کو تڑپتا چھوڑ گئی۔ بات ہی کیا تھی، ذرا سی بات پر وہ بگڑ گئی۔

بھاگنے سے ایک روز پیشتر روپا ایک نئے جھمکے کی جوڑی پہنے تھی، ادھیر بولا "یہ جھمکے کہاں سے لائی؟" اٹھلا کر بولی کیوں اچھے ہیں نا؟" ادھیر بولا میں پوچھتا ہوں 'یہ لائی کہاں سے؟ وہ جھمکوں کو ہلکی سی جنبش دے کر بولی میرا بھیا لایا ہے"۔

"ہوں تیرا بھیا لایا ہے، آج تک تو تیرا کوئی بھیا نظر نہ آیا، مگر آج وہ چکلے سے صرف تجھ کو جھمکے دیکر چلا گیا، یہ کہہ کر ادھیر نے دو تھپڑ رسید کئے اور وہ چیختے ہوئے جھمکے ہلنے لگے، اسی رات روپا بھاگ گئی اور ادھیر تنہا رہ گیا،

آج رات کو پھول مت لیٹتے وقت ادھیر کو بری طرح یاد آرہی تھی، بیچاری پھول مت کتنی حسین لڑکی تھی اف خدا وہ ساون کا جھولا اسے بے اختیار یاد آگیا۔ اور دھانی چندری میں سکراتا ہوا پھول مت کا چہرہ آموں کے درختوں میں چوری چوری ملنا اور پھول مت کی گرم سانسیں! وہ رات بھر سو نہ سکا، نہ جانے وہ کہاں ہے، کیا اب بھی وہ اتنی ہی حسین ہے۔ جیسی وہ پہلے تھی، صبح اٹھتے ہی اس نے گاؤں کے لوگوں سے دریافت کرنا شروع کیا، ایک کسان نے بتایا کہ پھول مت گاؤں کے آخری کونے پہ ایک کھیت میں کام کرتی ہے، ادھیر بولا "کیا تم سچ کہتے ہو، کیا وہ اب بھی جوان ہے، کیا اس کے مدھ بھرے نینوں میں اب بھی چمک ہے۔

بڈھا کسان ہنس پڑا، آج کل کے لڑکے کتنے پاگل ہوتے ہیں" میری پھول مت، ادھیر کھلکھلا کر ہنس پڑا، بازار جاکر اس نے ایک قیمتی جھمکے کی جوڑی خریدی اور اپنی پھول مت کو منانے چل دیا۔

راستہ بھر وہ سوچتا جا رہا تھا وہ اب بھی حسین ہے بالکل ویسی ہی جیسی پہلے تھی وہی جوانی، وہی متوالا پن اور جب وہ اس کے سامنے جائے گا تو وہ بالکل بچوں

بچوں کی طرح سے اس کے شانے پر اپنا سر رکھ کر رو دے گی اور وہ اس کو منائیگا پیار کرے گا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر کہے گا" میں واپس آ گیا،
پھول مت مجھے معاف کر دو اپنے ادھیر کو اب میں تجھے کبھی بھی اپنے سے جدا نہیں کروں گا اور پھر وہ ہنس دے گی اور یہ چمکتے ہوئے جھمکے پہنا کر وہ اس کو اپنے گھر لے آئے گا۔

جیسے ہی وہ گھوڑے سے اترا، کچھ کسان اب بھی کھیتوں میں نظر آ رہے تھے وہ فوراً پکا" پھول مت کو جانتے ہو؟" وہ اشتیاق سے بولا۔ ہاں وہ بیٹھی ہے" اور ادھیر سہم کر رہ گیا، ہاتھوں کی نبضیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور اس کا سر چکرا گیا ___ نہ وہ حسن تھا، نہ جوانی نہ دھانی چندری تھی۔ ادھیر کا ہاتھ بڑھا اور کوئی چمکتی ہوئی چیز آ کر پھول مت کی گود میں گر پڑی نظر اٹھا کر دیکھا تو ادھیر گھوڑے پر سوار واپس جا رہا تھا وہ پکاری" ادھیر! مگر وہ جا چکا تھا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں پھول مت کی گود میں پڑے ہوئے جھمکوں پر پڑ رہی تھیں اور آنکھیں رو رہی تھیں " رم جھم" رم جھم" !

رات کو دس بجے جب اکبر واپس آیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل اور دماغ کے دریچے کھل گئے ہوں اور ان میں سے بھینی بھینی خوشبوؤں کی لہریں نکل رہی ہوں۔ بس یونہی وہ مسکرا رہا تھا گنگنا رہا تھا! دنیا کس قدر حسین ہے کتنی دلکش!!

کپڑوں کی سرسراہٹ سے وہ چونک سا گیا۔ سامنے اس کی نئی ملازمہ بانو کھڑی تھی۔

"کھانا لے آؤں"۔

"ہوں" تھوڑی دیر میں کھانا اس کے سامنے تھا۔

"آج آپ نے بہت دیر کر دی" وہ بولی۔

"ذرا ٹھہر گیا تھا" وہ منہ میں نوالہ رکھتے ہوئے بولا۔

"بیگم صاحبہ آپ کا انتظار کرتے کرتے سو گئیں" وہ قالین کے کونے پر سمٹ کر بیٹھ گئی اور لنواز کی نگاہیں بانو کے شگفتہ چہرے پر جم کر رہ گئیں، یہ غریب جن کے پاس تن ڈھانکنے کو کپڑا تک نصیب نہیں، جن کو پیٹ بھرنے کو روٹی میسر نہیں ہوتی جو کوڑی کوڑی کے لئے خاک چھانا کرتے ہیں کیا وہ اتنے حسین بھی ہو سکتے ہیں؟ کیا ان کی نگاہوں میں بجلی کی سی چمک اور ان کی رفتار میں

رقاصہ کا سا لوچ ہو سکتا ہے؟ یہ حسین غریب، امیر کیوں نہیں ہوتے، بانو کی جوانی"
یہاں تک سوچنے پایا تھا کہ ایک بار پھر بانو کی جھکتی ہوئی جھینپی جھینپی نگاہیں
اس کی نگاہوں سے لڑ گئیں اور بانو نے گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ دوپٹہ سے
اپنے سر کو چھپا لیا۔ جیسے نواز کی تیز نگاہیں اس کو نگل لیں گی۔

جیسے ہی وہ کھانا کھا چکا، وہ تیزی سے ڈرتی ڈرتی کھانے کی میز صاف کر کے
بھاگی، آج پورے مہینہ کے بعد جب سے وہ نواز کی ماں کے پاس نوکر ہوئی تھی
اس کو نواز کی گھورتی ہوئی نگاہوں سے ڈر سا لگنے لگا تھا۔ گویا آج صرف آج
نواز کو بانو کی جوانی کا احساس ہوا تھا، وہ رات بھر نہ سو سکی، اس کی آنکھیں
خود بخود بوجھل سی ہو گئیں۔ اس کا دل دھڑکتا اور جلتا رہا وہ سوچتی رہی۔ مگر
اس کا دماغ کچھ بھی حل نہ کر سکا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ نواز کے کمرے میں صراحی اور
گلاس کے موجود ہوتے ہوئے بھی نواز نے بانو کو پانی کے لئے اپنے کمرے میں
بلایا اور ایک روز ڈرتے ڈرتے جب بانو نے کہا "پانی تو آپ کے کمرے میں موجود
ہے۔ پھر مجھے کیوں بلاتے ہیں؟" تو اس پر نواز نے بگڑ کر کہا

"تم نوکر کاہے کے لئے ہے؟ وہ سہم کر رہ گئی۔ کئی روز نواز نے اس سے
بات نہ کی، کمینی اکڑتی بہت ہے؟"

عید کی صبح سب ہی نے کپڑے بدلے، نواز غسل کر کے جیسے ہی عیدگاہ
جانے کے لئے نکلا، تو اس نے دیکھا بانو لال لچکے کا دوپٹہ ریشم کی قمیض اور

چوڑی دار پاجامہ پہنے صحن میں کھڑی تھی، وہ بالکل مغل شہزادی معلوم ہو رہی تھی، بھری بھری پنڈلیوں میں کسا ہوا پائجامہ کانوں میں چمکتے ہوئے بندے جو ذرا سی جنبش پر چمک اٹھتے تھے، جیسے ہوا کے ایک خفیف سے جھونکے سے شبنم کے قطرے سِس سِس کر رہے ہوں۔ وہ مسکرا دیا۔ "بانو"۔۔۔
"جی"۔۔۔ جب وہ اپنے آپ سے شرماتی، اس کے قریب آئی تو نواز کا چہرہ اور کان ایک دم گلابی ہو گئے۔

"عید مبارک ہو" نواز نے مسکرا کر کہا

"جی" وہ دب کر پیچھے ہٹ گئی

"اپنی عیدی تو لے لو" نواز نے ایک چمکتا ہوا روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تو نواز کے جسم بھر میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ بانو سلام کر کے چلی گئی اور وہ اس کے قدموں کو کھڑا دیکھتا رہا

آج رات کو وہ پھر دیر کر کے آیا اور بانو نے کھانے کے لئے پوچھا تو نواز نے بیتابی سے کہا "کب سے انتظار کر رہا ہوں" جتنی دیر تک وہ کھانا کھاتا رہا۔ طرح طرح کے سوالات اس سے کرتا رہا

"تمھاری ماں کب مری تھی؟ تمھاری پرورش کس نے کی، تمھارا نام تو بہت پیارا ہے، کس نے رکھا تھا اور بانو کے ماتھے پر پسینہ کے قطرے چمکنے لگے، اس نے گھبرا کر نواز کو دیکھا، آج وہ کس قدر بہکی بہکی باتیں

کر رہا تھا وہ دن بدن اس سے بے تکلف ہوتے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ کھانے کے برتن اٹھانے لگی تو نواز نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بانو"

اللہ میرا ہاتھ چھوڑیئے۔

"بانو" وہ پاگلوں کی طرح بک رہا تھا، یہ تکلف، یہ حجاب کب تک رہے گا"۔

"اللہ میرا ہاتھ چھوڑیے۔ اگر کوئی دیکھ لے"۔

"کوئی دیکھ لے تو کیا ہوگا" مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تمھیں اپنی بنا کے چھوڑوں گا"۔

"نواز میاں" وہ کھڑی کانپ رہی تھی" آپ کو آج یہ کیا ہوگیا ہے" آن کی آن میں اس کے آنسو آنکھوں سے ڈھل کر ٹھوڑی پر جمع ہو گئے اور ٹپ ٹپ کر کے اس کے کپڑوں میں جذب ہو گئے۔ اس کی رنگ برنگی چوڑیاں چکنا چور ہو کر فرش پر بکھر گئیں اور نواز نے اپنے لب کچھ اس انداز سے اس کے لبوں پر رکھے کہ بانو نے کسمسا کر چیخ ماری کہ سب لوگ گھر کے دوڑ پڑے۔

"نواز اس کی ماں نے گھبرا کر پکارا"

"امی یہ کمینی چھوکری مجھ سے عشق کرنا چاہتی ہے۔ اس کی اتنی جرأت۔ آوارہ کہیں کی"۔

"بیگم صاحبہ" یہ نواز میاں" اس کے آگے وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی ہر شخص اس کا منہ حیرت سے تک رہا تھا۔

جھوٹی کہیں کی" رئیسوں کے بچوں کو ایسی ہی ذلیل، کمینی عورتیں خراب کرتی ہیں، جن کی نہ عزت، نہ عصمت،

"لیکن میں تو بے گناہ ہوں" وہ تڑپ کر بولی

چل دور ہو، میرے لال کو بدنام کرتی ہے چڑیل،

"امی یہ آوارہ ہے" نواز نے آستین چڑھا کر کہا

ڈائن کہیں کی" اس کی ماں بولی

اور بانو کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا غریب جو تھی نا! وہ اسی رات گھر سے نکال دی گئی، اکیلی، تنہا، اور وہ نیم کے درخت کے نیچے جا کر گر پڑی جس کی گھنی گھنی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں، دور کہیں، تالاب میں زور زور سے مینڈک بول رہا تھا اور بانو ٹوٹے ہوئے رباب کی طرح شکستہ پڑی رو رہی تھی، شاید اپنی غریبی پہ!!!

جہلم کے کنارے

تم یوں ہی کب تک بیٹھے رہو گے میرے دوست! خاموش اور ساکت، اس جہلم کے کنارے یہ اٹھلاتی ہوئی مست لہریں، یہ خوش گوار ہوائیں ہمیشہ چلتی رہیں گی، ہزاروں طوفان آئیں گے اور لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر پھر اطمینان اور مستی سے بہنے لگ جائیں گی۔ خزائیں نشاط نشالا مار اور ہزاروں باغوں کے پھولوں کو کملا دیں گی اور پھر بہاراں میں وہی دلکشی وہی حسن اور وہی جوبن پیدا کر دے گی۔ یہ دنیا کا جوش کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ آمدرفت کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

گلمرگ جاتے ہوئے سفیدے کے لمبے لمبے خوبصورت درخت جو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں یہ روزانہ نہ جانے کتنی بسوں کو آتے اور جاتے دیکھا کرتے ہیں۔ جن میں جوان، بوڑھے اور بچے سب ہی ہوتے ہیں۔ یہ بسیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں اور پھر پانچ چھ مہینے بعد یہ لمبی لمبی سڑکیں بالکل سونی ہو جاتی ہیں، اور وہاں سفید سفید برف جم جاتی ہے، یہ کئی کئی برس کے چنار کے درخت جو کھڑے لہرا رہے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں، مگر بولنے سے مجبور ہیں۔ انھیں درختوں کی چھاؤں میں کشمیری بچے، گندے اور میلے کپڑوں میں لپٹے، چہرے پہ میل اور مٹی ملے رو یا اور ہنسا کرتے ہیں۔ نقری

قہقہے، سسکیاں اور باریک چیخیں گونجا کرتی ہیں ۔ اس جہلم کے کنارے جوان اور بوڑھے کشمیری مرد اور عورتیں میلے اور گندے پانی میں نہایا کرتے ہیں ۔
وہ اس گندے پانی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اس کو اس کی گندگی کا قطعی احساس نہیں ہوتا اور ان کو اپنے غلیظ اور بدبودار کپڑوں سے گھن تک نہیں آتی ۔ وہ غریب ہیں اور غربت اور مفلسی ان کی ساتھی ہے ۔ وہ دن بھر محنت کرتے ہیں، کھیتوں میں کام کرتے ہیں ۔ بوجھ اٹھاتے ہیں، کشتی چلاتے ہیں ۔ سامان بیچتے ہیں ۔ مزدوری کرتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں کشمیری پھول پھل ۔ درخت ۔ زعفران اور حسن کے عادی ہو چکے ہیں ۔ اب اس میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ۔ رنگ برنگے پھولوں، جہلم کی لہروں اور خوش گوار فضاؤں سے زیادہ ان کو پیسہ کماتے ہیں مزہ آتا ہے ۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔

جوں ہی ڈل لیک پر وہ کسی ہندوستانی کو دیکھتے ہیں، وہ سب کے سب پکار اٹھتے ہیں ۔ شکارہ چاہئے جناب ؟ نشاط لے جائے گا نشالا مار کی سیر کرائے گا ۔

اور یہ انگریز ہر وقت شکارے پر بیٹھے ہنستے مذاق کرتے نظر آتے ہیں وہ زندگی کی شراب کا ایک ایک قطرہ پی جانا چاہتے ہیں ۔ وہ کھاؤ، پیو، ہنسو، اور مر جاؤ، وہ ان شکاروں کے اندر جن پر رنگ برنگے

کے پردے پڑے رہتے ہیں مغرب کی کسی نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی نازنین کے ہمراہ قہقہے لگاتے، آہیں بھرتے اس جہلم کے پانی پر سے گذرا کرتے ہیں اور ان کی دھیمی دھیمی آوازیں جن کو یہ کشمیری مانجھی نہیں سمجھتے عشق و محبت کے پیمان باندھا کرتے ہیں۔ "او مائی ڈارلنگ" انگریز کہتا ہے اور وہ نیلی آنکھوں والی لڑکی شرارت سے اس کا ہاتھ دبا دیتی ہے۔

شکارہ بہتا ہوا چلا جاتا ہے، کوئی نشاط کی طرف، اور کوئی شالامار کی طرف اور مانجھی زور زور سے پتوار چلائے جاتے ہیں۔ "گڈلک صاحب کی اور ے"۔ میم صاحب کی اور ے۔ وہ کبھی کبھی پکار اٹھتے ہیں۔ اور انگریز ان کی زبان سے بے خبر اپنی اپنی محبوبہ سے وعدے کرتا ہے کہ دو مہینے کے بعد وہ پھر کشمیر آئے گا اور اس سے ملے گا"۔ اور وہ لڑکی سنتی رہتی ہے وہ ان جملوں کی عادی ہو چکی ہے نہ جانے کتنے فوجی افسر اس سے یہی وعدہ کر کے جا چکے ہیں مگر وہ کبھی واپس نہیں آئے۔ شروع شروع میں وہ عرصہ تک اپنے محبوب کی واپسی کی راہ دیکھتی رہی۔ اس جہلم کے کنارے مگر وہ واپس نہیں آیا۔ لہٰذا اب وہ ان جملوں کی عادی ہو چکی ہے۔

اس ہاؤس بوٹ کا مالک جو ایک چالاک کشمیری ہے۔ ہمیشہ میلے اور پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ اس کی بیوی ایک حسین کشمیرن ہے۔ جس کا نام عزیزہ ہے اس کا پہلا بچہ ابھی صرف چار مہینے کا ہے۔ وہ دن بھر اپنے ہاؤس بوٹ کی

کھڑکی سے جھانکا کرتی ہے۔ وہ پیدا ہوئی ہٹ ہاؤس میں ہوئی اور اسی میں مر جائے گی
وہ بہت محنتی ہے۔ دن بھر ہوٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے کام کیا کرتی ہے اور رات کو
جب اس کا شوہر جوا کھیل کر آئے گا تب وہ اٹھلاتی ہوئی اٹھے گی اور اس چھوٹی سی
جان کو جو ننھے ننھے چمکتے ہوئے دیدوں سے ماں کو گھور رہی ہے الگ کر دے گی اور جلدی
سے حقہ بھر کر اور چائے بنا کر اس خرانٹ کشمیری کے سامنے رکھ دیگی۔ جو دن بھر جھوٹ
بولا کیا اور جوا کھیلا کیا۔ اگر وہ جیت کر آیا ہے تب تو اسے پہلو میں بٹھائے گا اور
وہ اس کے پیر دبائے گی۔ میٹھی میٹھی باتیں کرے گی۔ لیکن اگر ہار کر آیا ہے تو وہ دو
چار چپت رسید کر دیگا اور وہ سسک سسک کر روئے گی اور اپنی کشمیری زبان
میں نہ جانے کیا کیا کہے گی اور سو جائے گی۔ صبح بغیر منائے وہ اپنے کام پر چلا
جائے گا اور دن بھر سخت سے سخت محنت کرے گا اور وہ بچے کو تھپک تھپک کر
سلائے گی اور پھر رات کا انتظار ــــــ!

کتنے ہی شکارے الٹ گئے اور اس جہلم کے پانی میں لاشیں غرق ہو گئیں۔ کچھ
ملیں اور باقی اس جہلم نے اپنے آغوش میں چھپا لیں۔ کشمیری عورت روتی ہوئی
کنارے پہ آئی۔ مانجھی لاشیں ڈھونڈھتا رہا مگر اس کے بیٹے کی لاش نہ ملی
وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ شکارے الٹ جانے سے لوگوں نے شکاروں پہ بیٹھنا
چھوڑ نہیں دیا۔ کچھ شکارے اب بھی تیز تیز گھوم رہے تھے۔ کشمیرن چیخ چیخ کر
روئے جا رہی تھی۔ اور ایک سوبھر اپنی ایک کالی ہندوستانی محبوبہ کو پہلو میں لیے

بیٹھا بار بار کہہ رہا تھا۔ OH MY LOVE اور ماجھی زیج مار رہے تھے۔ گرڈلک صاحب کی اوئے۔ میم صاحب کی اوئے۔ کشمیرن کی آواز اب بھی آرہی تھی۔ اور وہ روئے جارہی تھی۔

سڑک پر دو ہندوستانی جارہے تھے ایک بولا

" بھگوان کرے شملہ کی کانفرنس کامیاب ہو اور نیشنل گورنمنٹ قائم ہو جائے

دوسرا بولا۔

" ابھی ہندوستانی اس قابل نہیں کہ ان کو اتنے اختیارات دیدیے جائیں۔ ہندوستان کو اتنے فرقوں میں تقسیم کرنے سے بہت خرابیاں پیدا ہو جائیں گی "

پہلا بولا۔

" ترقی کرنے سے ہوتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہندوستانی تجارت کو ترقی دیں اور ایک دم غیر ملکی سامان خریدنا بند کریں۔ ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا پہنیں اور ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں خریدیں "

دوسرا بولا۔

" یہ کیسے ممکن ہے ہم بعض غیر ملکی چیزوں کے محتاج ہیں۔ اور پھر ابھی ہندوستان تجارت کے معاملے میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ ہر ایک گاندھی جی بنکر ایک دھوتی اور بکری کے دودھ پر بسر نہیں کرسکتا "

پہلا بولا :—

"تم بے وقوف ہو۔ جب تم نہ اپنے ملک کو ترقی دو گے نہ اپنے ملک کو آزاد کراؤ گے تو پھر کون کرائے گا۔"

دوسرا بولا :—

"ہندوستان اور آزادی۔ اماں کیا بکواس لگا رکھی ہے ہر طرف انقلاب انقلاب کے نعرے لگاتے ہو۔ ہندوستان کی تجارت کو ترقی دینا چاہتے ہو۔ غیر ملکی سامان سے پرہیز کرنا چاہتے ہو۔ مگر اپنے بچوں کو امریکہ اور ولایت تعلیم کے لئے بھیج کر فخر کرتے ہو وہ آنکھیں کھول کر مغربی طور طریقے سیکھتے ہیں۔ مغربیت پسند کرتے ہیں اور جب ہندوستان آتے ہیں تو انگریزی بولتے ہوئے۔ اب اگر تم ان سے کہو کہ غیر ملکی سامان استعمال نہ کرو تو وہ تم کو کیا جواب دیں گے۔ کیا تمہارے ہندوستان میں جس کی ہر چیز پر تم فخر کرتے ہو۔ ناز کرتے ہو کالج اور یونیورسٹی نہیں۔ جو تم غیر ملکی تعلیم دلواتے ہو اور ان لوگوں کی نگرانی اور سوسائٹی میں بھیجتے ہو۔ جن سے تم الفت کرتے ہو۔ پرہیز کرتے ہو۔ تم خود ہی بتاؤ تم کہاں تک سچے ہو۔"

وہ لڑتے جھگڑتے اس جہلم کے کنارے پر سے گزر جاتے ہیں وہ سب کچھ سنتا ہے، دیکھتا ہے اور خاموش رہتا ہے نہ جانے اس کے سینے میں کتنے افسانے پنہاں ہیں۔

جب ساز ٹوٹ گئے

"ہش" اس نے بڑے رازدارانہ طریقے سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے
کہا اور میں ایک دم ساکت ہو کر بیٹھ گئی۔
سیما۔ میں نے اندھیرے میں آہستہ سے پکارا۔
"مری کیوں جا رہی ہو؟"
"میرا دم گھٹا جا رہا ہے؟"
"بس تھوڑی دیر اور"
"ہائے اللہ"
پھر میں نے اس کو گھاس پر رینگتے ہوئے دیکھا جیسے سانپ کا بچہ۔ وہ ٹوکری
میں رکھی ہوئی کچی کچی کیریاں اپنے ڈوپٹہ میں جلدی جلدی رکھنے لگی۔
"ارے خدا کے لئے بس کرو، اگر چوکیدار آگیا تو قیامت ہو جائے گی"
"چلو مگر ذرا آہستہ سے" سیما اور میں چوروں کی طرح سے چپکے چپکے کوٹھری
سے باہر نکلے اور گھر کی طرف تیزی سے بھاگے ___ اگر آموں کی فصل میں تھوڑی
سی کیریاں چرالیں تو اس کو چوری نہیں کہتے۔ اور پھر کچی کچی کیریاں دیکھ کر تاب
بھی تو نہیں ہوتی فوراً منہ میں پانی بھر آتا ہے۔
گھر پہنچ کر اطمینان کے ساتھ سیما نے اپنا آنچل کھولا اور سبز سبز کیریاں زمین

پر آ رہیں۔ ہم دونوں چوری کا مال دیکھ کر کھلکھلا اٹھیں۔ اتنی ایک کیریاں۔

"سیما میرا دل تو ابھی تک قابو میں نہیں"

"لا دیکھوں" میں نے سیما کا ہاتھ اپنے دل پر رکھ دیا

"یہی خیریت ہوئی کہ ابھی تک دھڑک رہا ہے فیل نہیں ہوا۔

"ہٹ" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا

سیما جا تھوڑا سا نمک لے آ، پھر کیریاں کھائیں"

"نہیں بابا اب مجھ میں اٹھنے کی سکت نہیں تم جاؤ"

"نہیں تم"

"نہیں تم" مجبوراً میں نے بغیر نمک کے کیریاں کھانا شروع کر دیں ــــ رات گئے تک ہم دونوں تکیہ کے نیچے کیریاں رکھ کر کھایا کئے۔

نہ جانے مجھے سیما سے اس قدر کیوں محبت تھی، جب سے میں نے ہوش سنبھالا سیما کو اپنے گھر میں دیکھا۔ دبلی پتلی سی نکھری ہوئی سیما جو ہر وقت ہنستی رہتی۔ جب سے سیما کی ماں مری۔ اس وقت سے وہ امی ہی کے پاس رہتی تھی۔ ہم دونوں ساتھ کھیلتے ساتھ سوتے۔ ساتھ اسکول جاتے تھے۔ گھر میں اور کوئی بچہ نہ تھا سوائے میرے اور سیما کے۔ بھیا پانچ برس سے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جب بھیا کے ولایت سے خطوط و تصویریں آتیں تو میں اور سیما گھنٹوں بیٹھی ان کو دیکھا کرتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ابا نے بھیا کو ولایت بھیجا تھا۔ اس وقت وہ ، ابرس

کے تھے۔ گورے سے دبلے پتلے اور بے حد شریر۔ ہر وقت سیما کو اور مجھے چڑاتے رہتے مارا کرتے اور جب ہم دونوں رونے لگتیں تو امی سے ہماری الٹی شکایتیں کر دیتے کہ "دیکھئے امی یہ دونوں باہر زمین پر بیٹھی اپنے کپڑے میلے کر رہی تھیں میں نے ذرا ڈانٹ دیا تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا بھتنیاں کہیں کی" اور پھر امی بھیا کی چالوں سے بے خبر ہو کر ہم دونوں پر خفا ہوتیں، سزائیں دی جاتیں۔

جب بھیا ولایت جانے لگے تو بجائے رنجیدہ ہونے کے ہم دونوں بہت خوش تھے کہ تو گھر سے بلا گئی۔ نہ اب کوئی مارنے والا ہوگا۔ نہ امی سے شکایت کرنے والا اب چاہے ہم جتنا بھی مٹی میں کھیلیں یا دھوپ میں ننگے پیر پھریں۔ امی رو رہی تھیں ابا رنجیدہ تھے اور سیما اور میں باورچی خانے کی کھڑکی کے پاس کھڑی خوش ہو رہی تھیں کہ بھیا جا رہے ہیں۔ بھیا چلے گئے۔ اس کے بعد ہم دونوں کو بھیا کی کمی محسوس ہونے لگی۔ ہر طرف خاموشی تھی نہ کوئی ستانے والا تھا نہ شکایت کرنے والا۔ سیما اور میں چھپ چھپ کر دعائیں مانگتیں کہ بھیا جلد آجائیں۔ مگر اتنی دعائیں مانگنے کے بعد بھی بھیا نہیں آئے۔ بھیا کی تصویریں دیکھ کر میں سیما سے کہتی، سیما دیکھ میرے بھیا اب کتنے خوبصورت ہو گئے ہیں، کتنی بھری بھری بانہیں ہیں اور یہ ٹھوڑی پہ رخسار کا ننھا سا گڑھا ——— آنکھوں کی شرارت ابھی تک نہیں گئی۔ ہم دونوں بھیا کی خوبصورتی پر باتیں کیا کرتے۔ پھر ایک دن ان کا تار آیا کہ وہ پاکستان آ رہے ہیں۔ ابا ان کو لینے کے لئے بمبئی گئے تھے۔ کس قدر

سے دو دن گزرے تھے، خدا خدا کرکے بھیا گھر آئے۔ امی خوشی سے پھولی نہیں سماتی
تھیں۔ آج ان کا بیٹا ولایت سے ڈگری لیکر گھر آرہا تھا۔ ہم سب ان کو لانے
اسٹیشن تک گئے۔ وہ مسکراتا ہوا بھیا کا چہرہ، نکھرا ہوا شاداب رنگ۔ خوشی پھیلاتی آنکھیں
امی نے ان کو گلے لگالیا۔ "میرا بیٹا، میرا لال" وہ روئے جارہی تھیں۔
سیما دور کھڑی بھیا کو دیکھ رہی تھی۔ جب امی نے کسی کام سے اس کو پکارا تو
بہت دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی آئی۔ میں نے بھیا سے کہا۔ بھیا آپ نے پہچانا یہ
سیما ہے۔

"ارے سیما، یہ تو بالکل جوان ہوگئی"
"بات کیجئے" بھیا کے کمرے میں جانے لگی تو زبردستی سیما کو بھی اپنے ساتھ
لے گئی۔

"کیا کہیں" بھیا مسکرا دئے۔
"بھیا! اچھا سچ بتلائیے۔ آپ ہم لوگوں کو یاد بھی کرتے تھے یا نہیں"؟
"ہاں کبھی کبھی۔ سب بہت یاد آتی تھیں۔"
"اور میں" سیما بولی۔
"سچ پوچھو۔ تمہیں تو میں بھول گیا تھا، مگر اب تو تم میرے دماغ پر چھائی
جا رہی ہو" — ہم دونوں ہنس دئے۔ بھیا کی شرارتیں بالکل ویسی ہی
تھیں، جیسے پہلے تھیں۔

اکثر میں نے محسوس کیا کہ سیما بھیا سے بیحد دلچسپی لینے لگی۔ وہ ہر وقت بھیا کا ذکر کیا کرتی۔ ان کے کمرے کو بار بار صاف کرتی جب وہ باہر جاتے تو وہ پہروں ان کا انتظار کیا کرتی اور جب وہ آجاتے تو سیما کا چہرہ گلابی ہو جاتا۔ وہ مسکرا مسکرا کر ان کو دیکھتی اور جب وہ چلتی تو اس کے کمر میں بے انتہا لوچ پیدا ہو جاتا ——— اور بھیا جس وقت سے اندر آتے ان کی صدائیں آیا کرتیں۔
"سیما میرا تولیہ نکال دو" "سیما میرا اخبار کہاں ہے" "سیما میرا سگریٹ کیس امی کے کمرے میں رکھا ہے لے آؤ" "سیما یہ کرو، سیما وہ کرو" ———
سیما سیما سیما۔ ہر طرف سیما کا نام۔ جیسے بھیا کی ہر سانس سے سیما نکلتا ہو میں اکثر بگڑتی۔ بھیا مجھے اس طرح کیوں نہیں پکارتے جس طرح وہ سیما کو پکارتے ہیں۔ ایک دن میں ان کے پاس کھڑی تھی جب بھیا نے پکارا، سیما چائے لاؤ میں نے کہا۔ میں لے آتی ہوں بھیا" "نہیں۔ نہیں نسرین تم زحمت نہ کرو۔ آخر سیما کس لئے ہے، میں اصرار کرتی رہی اور وہ منع کرتے رہے آخر سیما چائے لیکر آگئی، بھیا مسکرا دئے۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ بھیا کو مجھ سے اتنی نفرت اور سیما سے اتنا لگاؤ کیوں ہے؟ وہ تو ان کی بہن بھی نہیں ہے پھر بھیا اس کو کیوں اتنا چاہتے ہیں ——— ؟ کیوں چاہتے ہیں ——— ؟
رات کو جب میں سونے کے لئے لیٹی تو میں نے چپکے سے سیما سے پوچھا۔
"سیما بھیا تم سے کیا باتیں کیا کرتے ہیں" میں نے دیکھا۔ میرے اس جملہ پہ

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اس کی نگاہوں میں بہت سے راز انگڑائیاں لینے لگے۔

میرے بے حد اصرار پر اس نے کچھ ایسی باتیں بتلائیں جن کو سن کر نہ تو مجھے یقین آیا اور نہ میں سمجھ سکی کہ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ —— یہ سب کیا ہے جو سیما کہتی ہے؟ —— اتنی خراب سی باتیں جن کا کوئی تک نہیں۔ بھیا کا ایسا پڑھا لکھا قابل انسان ایسی گندی باتیں کیسے کر سکتا ہے اور پھر یہ سب ان کو سکھایا کس نے سیما جھوٹی ہے۔

اس رات بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی میں کچھ نہ سمجھ سکی —— میں سوچتی رہی۔ یکایک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا جیسے بھیا کی پرچھائیں سیما کی پلنگ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے —— میں نے سہم کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند سکنڈ کے بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں —— اب وہ سیما کے پاس چپکے کھڑے اس کو دیکھ رہے تھے میرا دل دھڑکنے لگا۔ انھوں نے آہستہ سے اس کے رخسار میں چٹکی لی وہ کسمسائی۔ انھوں نے پکارا "سیما" وہ پھر کسمسائی —— وہ تھوڑا سا اس کے اوپر جھک گئے اور ان کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئے۔ میرے ہاتھ پیر برف ہو گئے —— ہائے اللہ بھیا پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میں خدا سے دعا مانگنے لگی —— جب میں نے آنکھ کھولی

تو نہ بھیا تھے وہاں اور نہ سیما ـــــ اس کا پلنگ خالی پڑا ہوا تھا ـــــ
میرا دل ہل گیا ـــــ سیما ٹھیک کہتی تھی ـــــ بھیا اچھے آدمی
نہیں ـــــ

سیما اب زیادہ تر اپنے کمرے میں سویا کرتی مضمحل سی ـــــ اور پھر رفتہ
رفتہ اس کا پیٹ آگے کو بڑھنے لگا۔ جیسے کوئی غبارے میں ہوا بھر
رہا ہو۔

گھر والوں کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ ہر کونے میں چرچے ہونے لگے سیما۔
گھر اور گھر سے باہر کا عنوان بن گئی اور امی نے ایک دن اس کو مارا بھی ـــــ اسکی
چیخوں کی آوازیں میں نے اپنے کمرے سے سنی تھی۔ میں تلملا سی گئی۔ امی زندگی
میں پہلی مرتبہ اس کو مار رہی تھیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں رو دی۔ مجھے
سختی سے پابندی کی گئی کہ میں سیما سے نہ بات کروں اور نہ اس سے ملا کروں۔
ـــــ کتنی مشکل اور سخت سزا تھی ـــــ زندگی میں سیما مجھ سے
چھوٹ گئی۔ میں نے جب بھی کبھی اس کی جھلک دیکھی۔ وہ جیسے ابھی ابھی
رو کر اٹھی ہو۔ سرخ سرخ آنکھیں تھکی تھکی سی۔

امی نے جلد از جلد بھیا کی شادی کر دی ـــــ دلھن آئی بھیا کی پسند
کی ـــــ وہ بار بار مجھ سے کہتے

وو نسرین دلھن پسند آئی ؟ تمھاری بھابی کا جسم استھر دلیم سے ملتا جلتا ہے

کتنی حسین لڑکی ہے۔ ہماری پسند پر ہم کو داد دو گے

میں نے دیکھا مہمانوں کے پیچھے بہت دور پر میری بچپن کی سیما دولھا دلھن کو بڑی یاس سے دیکھ رہی تھی ___ بھیا خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور ان سے کچھ فاصلہ پر سیما کا دل رو رہا تھا ___ اس کی نگاہیں اس وقت بھی گلابی ہو رہی تھیں ___ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خوشی کے نغمے ایک ایک کر کے لُٹ گئے اور کسی کی گھٹی ہوئی سسکیاں فضاؤں میں گونج اٹھیں

پام کے گھنگھور درخت سے چاندنی جب اُس کے چہرے پر برسنے لگی تو اس نے کسمسا کر اپنی بھیگی پلکوں کو بھینچ لیا اور مچلتے ہوئے گرم گرم آنسو ٹپ ٹپ کر کے چادر میں جذب ہو گئے۔ چاند تیزی سے ایک سیاہ بادل میں چھپ گیا اور کچھ دیر کے لئے زہرا کے چہرہ پہ اندھیرا سا آ گیا۔

بہت دن گزرے آج سے دو سال قبل اس کی زندگی کے گلشن میں ایک غنچہ مسکرایا تھا اور مسکراتے مسکراتے پھول بن گیا تھا ـــــ زہرا نے اس پھول کو چاہا تھا اس سے عشق کیا تھا وہ پھول جس کو وہ پیار سے جامی کہہ کر پکارا کرتی تھی، اس کی پر شباب جوانی نے اس کو بارہا پیار کئے تھے۔ گرم گرم پیار، گھبرائے ہوئے پیار

"زہرہ"

"جامی"

"یہ پھول یہ شرمائے ہوئے غنچے تمھیں پسند ہیں نا؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

کیونکہ یہ خاموش ہیں ان کے دل محبوب کی قربت سے نہیں دھڑکتے نہ ان کو کسی کا انتظار ہے۔ بس یہ یوں ہی مسکرائے مسکراتے نڈھال ہو کر

کمھلا جاتے ہیں کسی کی یاد میں تڑپنا نہیں جانتے۔

"زہرا" جامی کی آواز میں جوش تھا" یہ انتظار یہ فرقت کہیں ہم کو بھی نڈھال نہ کردے۔" زہرا" نے جامی کی نگاہوں میں دیکھا تو اس کا دل چیخ اٹھا "ایسا نہ کہو جامی اور پھر گرم گرم سانسیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں،

وہ تیزی سے روش پر دوڑ رہی تھی، جامی آگے بھاگ رہا تھا، کئی بار وہ گرتے گرتے سنبھل گئی آخر اس کی سانس تیزی سے پھولنے لگی وہ چلائی" میں ہار گئی جامی اب چلا نہیں جاتا" لیکن وہ آگے بڑھتا ہی گیا۔ ایک جگہ پر وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ زندگی بھی ایک دوڑ ہے، ایک جوا ہے وہ جس قدر بھاگنے والے کا پیچھا کرتی ہے وہ آگے بڑھتا گیا۔ وہ جیتنا جیتنے کی کوشش کرتی وہ ہارتی رہی بالکل گھڑی کی سوئی کی طرح۔ بڑی سوئی آگے بھاگتی ہے اور چھوٹی اُس کا تعاقب کرتی ہے، جامی اور ہر ابھی تو سوئیاں ہیں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے

رو دیں زہرا؟ عورتیں بڑی بزدل ہوتی ہیں، مجھ کو دیکھو ذرا سا تھکا تک نہیں وہ فاتحانہ مسکراہٹ سے تکتا رہا۔

تم مردوں کا دل پتھر ہوتا ہے نا" اس کے ماتھے پہ کچھ ناگوار سلوٹیں پڑ گئیں "بگڑ گئیں"

"شاید وہ بچوں کی طرح رو دی، جیسے وہ صرف رونے کا ایک بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"زہرا"

"کہو"

"جامی کیسا ہے ذرا سچ بتلانا" حمیدہ نے تیز نگاہوں سے زہرا کے چہرے کا جائزہ

"بہت دلکش" وہ گلاب کے سرخ پھولوں کو تکنے لگی۔

"کلب عزیزہ اور رباب تو اس پہ جان دیتی ہیں لیکن جامی تو اسی طرح سے ہٹے ہوئے ہیں۔

"ہوں" زہرا کا دل ہل گیا۔ زینب کا چمکتا ہوا چہرہ ہنستی ہوئی [illegible] میں اس کے سامنے آگئیں۔ عزیزہ کا یادیسی، رباب کی شوخی اور زینب کی رومانٹک باتیں وہ [illegible]

اور جامی!

اس کا دل چاہا وہ حمیدہ کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ جائے مگر اس کے خیال کی کھٹک کون مٹا سکتا ہے۔

"جامی"

"ہوں"

"تم کلب مت جایا کرو"

"کیوں" اور زہرا سوچنے لگی وہ [illegible] کو کیا جواب دے

"مجھے پسند نہیں"

"لیکن مجھے تو پسند ہے"

"تم ہرجائی ہو"
"تم بیحد بد مزاق لڑکی ہو"

"یہ بد مذاقی نہیں حقیقت ہے"
"تمھارا مطلب؟"
"تم زینب سے عشق کرتے پھرتے ہو شرم نہیں آتی تم کو"
"یہ میری ذاتی باتیں ہیں اس میں تمھیں کیوں اعتراض"
"جامی" وہ چلائی
"میں تمھارا پابند نہیں رہ سکتا
"لیکن جامی میں   اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں
"مجھے تم سے نفرت ہے"

آج بہت سے تارے ٹوٹ رہے تھے۔ زہرا کی محبت آگ کی طرح سلگ رہی تھی۔ اِس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں بہت سی پھانسیں چبھی ہوں سامنے لان میں یوسف کھڑا تھا اور وہ اندھیرے میں کھڑی مسکرا رہی تھی ——— !